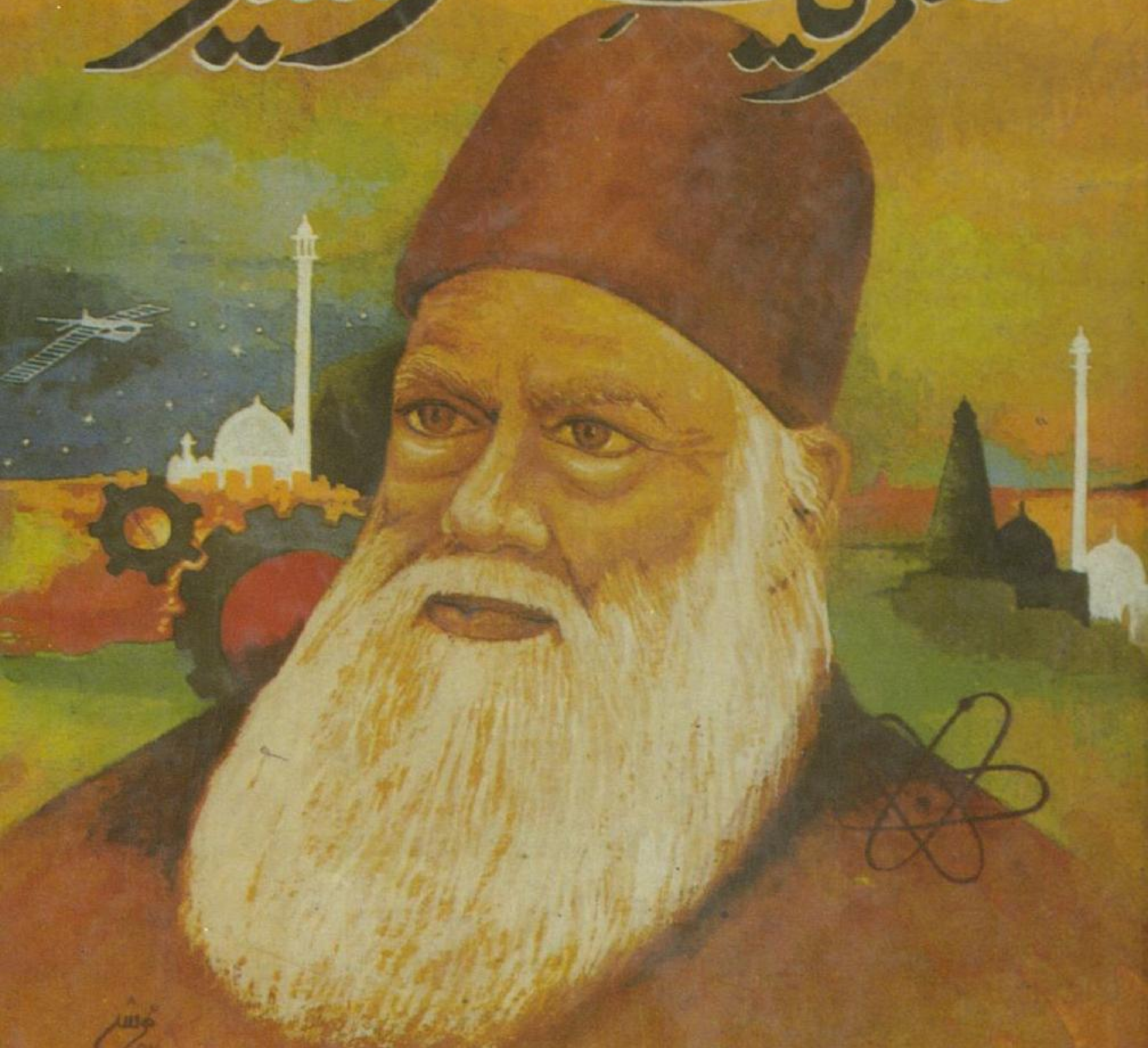
نظریاتِ سرسیّد



مرتّبہ

ڈاکٹر شاہد مختار

نظریاتِ سرسیّد

ڈاکٹر شاہد مختار

شاہد پبلشرز اینڈ بک سیلرز

چوبرجی سنٹر ملتان روڈ لاہور فون: ۷۴۱۹۹۶۳

زندہ کتاب کی علامت

کتاب ......☆...... نظریاتِ سرسیّد
مصنف ......☆...... ڈاکٹر شاہد مختار
ناشر ......☆...... خالد مختار، شاہد پبلشرز چوبرجی سنٹر
کمپوزنگ ......☆...... محمد ارشد ' خالد کمپوزنگ سنٹر
ٹائٹل ......☆...... احسان الٰہی صدیقی
مطبع ......☆...... خالد پرنٹرز، لاہور
قیمت ......☆...... 99 روپے

فہرست

سرسیّد احمد خان کے حالات زندگی

سر سید احمد خان ۵ر ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ بمطابق ۱۷ر اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام میر متقی اور والدہ کا اسم گرامی عزیز النساء بیگم تھا۔ آپ باپ کی طرف سے حسینی سید ہیں اور ان کا سلسلہ نسب ۳۶ واسطوں سے آنحضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ نسب نامہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ حضرت محمد رسول اللہ صلعم
۲۔ حضرت فاطمۃ الزہرا ○ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب
۳۔ حضرت امام حسینؓ
۴۔ حضرت امام زین العابدین
۵۔ حضرت امام محمد باقر
۶۔ حضرت امام جعفر صادق
۷۔ حضرت امام موسیٰ کاظم
۸۔ حضرت امام موسیٰ رضا
۹۔ حضرت امام محمد تقی
۱۰۔ سید موسیٰ مبرقع
۱۱۔ سید ابی عبداللہ احمد
۱۲۔ سید محمد عرج
۱۳۔ سید محمد احمد
۱۴۔ سید احمد
۱۵۔ سید موسیٰ
۱۶۔ سید احمد

۱۷- سید احمد
۱۸- سید علی
۱۹- سید جعفر
۲۰- سید محمد
۲۱- سید عیسیٰ
۲۲- سید ابوالفتح
۲۳- سید علی
۲۴- سید یار حسین
۲۵- سید کاظم الدین حسین
۲۶- سید جعفر
۲۷- سید باقر
۲۸- سید موسیٰ
۲۹- سید شرف الدین حسین
۳۰- سید ابراہیم
۳۱- سید حافظ احمد
۳۲- سید عزیز
۳۳- سید دوست محمد
۳۴- سید برہان
۳۵- سید محمد عماد
۳۶- سید محمد ہادی، سید محمد مہدی
۳۷- سید محمد متقی

سیّد محمد
ولادت ۸ر ربیع الاول ۱۳۵۹ھ
بمطابق ۹ر مئی ۱۸۴۳ء

سیّد احمد
۵ر ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ
بمطابق ۱۷ر اکتوبر ۱۸۱۷ء

تعلیم

قرآنی تعلیم کی ابتدا حضرت شاہ غلام علی صاحب کی گود میں مولوی حمید الدین سے کریما خالق باری و آمد نامہ وغیرہ پڑھے۔ ناظرہ قرآن کا درس ایک پردہ نشیں بی بی سے لیا۔ فارسی میں گلستاں بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ عربی میں شرح ملا۔ شرح تہذیب۔ میبذی۔ مختصر معانی اور مطول ما انا قلت تک پڑھی۔ ریاضی میں چند معمولی درسی کتابیں تحریر اقلیدس کے چند مقالے ہیئت میں شرح چغمنی تک اور متوسطات کے چند رسالے اور علم آلات رصد سے متعلق رسائل آلات رصد برجندی اور چند رسالے مثل اعمال کرہ۔ اعمال اصطرلاب۔ رسالہ صنعت اصطرلاب۔ ربع مجیب۔ ربع مقنطر۔ ہلزوں' جریب الساعتہ۔ پرکار تقسیم اور پرکار متناسبہ اپنے ماموں نواب زین العابدین سے پڑھے۔ حکیم غلام حیدر خان کی شاگردی میں طب کی ابتدائی کتابیں مثل قانونچہ اور موجز کے بعد معالجات سدیدی شرح اسباب اور نفسی امراض عین تک پڑھیں۔ پھر تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ انتیس برس کی عمر میں پھر ابتداء میں پڑھی گئی کتابوں کو ازسرنو غور سے پڑھا۔ دہلی کے مشہور واعظ مولوی نوازش علی سے کچھ فقہ مثل قدوری و شرح وقایہ اور اصول فقہ میں شاشی نور الانوار پڑھیں۔ مولوی فیض الحسن سے مقامات حریری کے چند مقامے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے۔ مولوی مخصوص اللہ سے مشکوۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزاء صحیح مسلم پڑھے۔ پھر قرآن مجید کی سند لی۔

سر سیّد خود اقرار کیا کرتے تھے کہ انہوں نے اس کے علاوہ استاد سے کچھ نہیں پڑھا۔

ملازمت

۱۸۳۸ء میں سر سید احمد کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً بائیس برس کی تھی۔ راجہ سوہن لال کی مخالفت کے باعث آمدنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تو آپ نوکری کی تلاش میں نکلے۔ اپنے خالو مولوی خلیل اللہ خان جو اس وقت دلی میں صدر امین تھے ان کی وساطت سے کچہری میں سر رشتہ دار مقرر ہوگئے۔ مسٹر رابرٹ

ہملٹن کی مدد سے آپ فروری ۱۸۳۹ء میں آگرہ میں کمشنر کے دفتر میں نائب منشی ہو گئے۔ ۲۴ر دسمبر ۱۸۴۱ء کو مین پوری کے منصف مقرر ہوئے۔ ۱۰ر جنوری ۱۸۴۲ء کو فتح پور سیکری تبدیل ہو گئے۔

۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ ظفر نے سرسیّد کو ان کے موروثی خطاب جواد الدولہ سید احمد خان عارف جنگ کے خطاب سے نوازا۔ ۸ر فروری ۱۸۴۶ء کو فتح پور سیکری سے دہلی تبدیل ہو گئے۔ اور ۱۸۵۴ء تک دہلی ہی میں مقیم رہے۔ اس عرصہ میں دو دفعہ ایک بار ۱۸۵۰ء اور دوسری بار ۱۸۵۳ء میں قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر رہتک جانے کا اتفاق ہوا۔ ۱۳ر جنوری ۱۸۵۵ء میں وہ مستقل صدر امین مقرر ہو کر دہلی سے بجنور تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوا دو برس ان کو گزرے تھے کہ غدر برپا ہو گیا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں بجنور سے صدر الصدوری کے عہدہ پر ترقی پا کر مراد آباد آ گئے اور ۱۸۵۹ء میں کمیشن تحقیقات جائیداد منضبط باغیان کے ممبر مقرر ہوئے۔ محمڈن ہائی سکول کے چندہ اکٹھا کرنے میں سرکاری نوکری آڑے آتی تھی۔ اس لئے جولائی ۱۸۷۶ء کے آخر میں ملازمت سے کنارہ کش ہو کر علی گڑھ تشریف لے آئے۔

تصنیفات

۱۸۴۰ء میں انہوں نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ مرتب کی جس کا نام جام جم رکھا۔ اس میں امیر تیمور صاحبقران سے لے کر ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف خاندانوں کے ۴۳ بادشاہوں کا حال مختصر طور پر سترہ سترہ خانوں میں قلمبند کیا۔

۱۸۴۳ء میں ایک مختصر رسالہ جلاء القلوب بذکرا لمحبوب جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات سے متعلق بیان تھا، شائع کروایا۔

۱۸۴۵ء میں تحفہ حسن شائع کیا جس میں انہوں نے تحفہ اثنا عشریہ کے باب دہم اور باب دوازدہم کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ مطاعن، تولا، تبرّہ سے متعلق جوابات دیئے۔ اس ترجمہ کے بعد پوری زندگی میں۔ آپ نے شیعوں سے متعلق کبھی کوئی کتاب، آرٹیکل یا رسالہ شائع نہیں کروایا۔

۱۸۴۴ء میں آپ نے بوعلی نام کے ایک عالم کے ترجمہ فارسی "بہ معیار العقول" کا

اردو ترجمہ "تسہیل فی جرا الثقیل" کے نام سے شائع کیا' جس میں بھاری چیزوں کے اٹھانے' سخت چیزوں کے چیرنے اور دشوار چیزوں کے دبانے اور نچوڑنے کے پانچ اصول اور ان کے بنانے اور استعمال کرنے کے طریقے اور مختلف ترکیبیں بیان کیں۔

۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید شائع کروائی۔ اس کے چار باب ہیں۔ پہلے باب میں تقریباً ۱۳۰ عمارات کا ذکر ہے جن میں ہندو اور مسلمان مغلوں کی بنائی ہوئی عمارتیں شامل ہیں۔ چند کے سوا ہر عمارت کا نقشہ اور کتبہ دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں لال قلعہ اور اس سے ملحقہ ۳۲ عمارتوں کا ذکر ہے۔ اس باب میں متذکرہ عمارتوں کے نقشے اور کتبے مندرج ہیں۔ تیسرے باب میں ۷۰ حویلیوں' مسجدوں' مندروں' بازاروں' باولیوں اور کنوؤں وغیرہ کا ذکر ہے۔ اور چوتھے باب میں شہروں' قلعوں اور محلوں وغیرہ کا ذکر ہے۔ جو ۴۰۴ بکرمی سے لے کر آخر وقت تک وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آباد کئے گئے۔ آب و ہوا اور زبان اردو کا ذکر ہے۔ مشاہیر اہل دلی کا حال لکھا ہے جس میں ۱۲۰ مشائخ علماء' فقراء' مجذوب' اطبا' قرا' شعرا' خوش نویس' مصور اور موسیقی داں وغیرہ کا بیان درج ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بعد از ترمیم و اصلاح ۱۸۵۴ء میں چھپ کر تیار ہوا۔ لیکن دوسرے ایڈیشن کے تمام نسخے غدر میں تلف ہو گئے۔ فرانس کے مشہور اورینٹ لسٹ موسیو گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں پہلے ایڈیشن کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا جسے دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید احمد خان کو ۴ر جولائی ۱۸۶۴ء کو اپنی سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کیا۔

۱۸۴۶ء میں اپنے نانا زبیر الدولہ کی فارسی میں لکھے گئے مسودات "اعمال پرکار متناسبہ" کا اردو ترجمہ رسالہ "فوائد الافکار فی اعمال الفرجار" کی صورت میں شائع کیا۔

۱۸۴۸ء میں حرکت زمین سے متعلق رسالہ "قول متین در ابطال حرکت زمین" لکھا۔ ۱۸۴۹ء میں پیری مریدی اور بیعت کے مروجہ طریقہ کے خلاف رسالہ "کلمتہ الحق" لکھا۔ ۱۸۵۰ء میں متبعین سنت کی تائید میں رسالہ راہ سنت در ردبدعت لکھا۔ ۱۸۵۲ء میں فارسی زبان میں رسالہ نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ شائع کیا۔ ۱۸۵۲ء میں ہی رسالہ سلسلہ الملوک لکھا جس میں راجہ یڈہشٹر سے لے کر ملکہ معظمہ قیصرہ ہند تک ۲۰۲ فرمانرواؤں کے نام باپ کے نام سنہ جلوس دارالسلطنت اور ان کے عہد سے متعلق نہایت تحقیقی کام کیا۔

۱۸۵۳ء میں آغاز کیمیائے سعادت کے چند اوراق کا ترجمہ لکھا۔

۱۳ر جنوری ۱۸۵۵ء میں وہ مستقل صدر امین مقرر ہو کر دلی سے بجنور تبدیل ہوئے تو انہوں نے ضلع بجنور کی تاریخ مرتب کی۔ اسی طرح انہوں نے اسی دور میں نادر الوجود کتاب آئین اکبری میں تصحیح و تکمیل کر کے اسے از سر نو زندہ جاوید کیا۔ ۱۸۵۸ء میں تاریخ سرکشی ضلع بجنور اور اسباب بغاوت ہندوستان لکھی۔ ۱۸۶۳ء میں تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملت الاسلام لکھی۔

۱۸۷۰ء میں رسالہ احکام طعام اہل کتاب شائع کیا جس میں انگریزوں کے ساتھ بشرطیکہ کھانے پر کوئی حرام چیز نہ ہو کھانا آیات و احادیث کی روشنی میں جائز قرار دیا۔ ۱۸۷۲ء میں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو لکھا۔ ۱۸۷۳ء میں ہندوستان کے طریقہ تعلیم پر اعتراضات انگریزی زبان میں شائع کئے۔

مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور انہیں ترقی کی طرف مائل کرنے کے لئے رسالہ تہذیب الاخلاق شروع کیا۔ پہلا پرچہ ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا اور یہ پرچہ پورے چھ برس تک نکلتا رہا۔ اس کے ایڈیٹر اور مینجر خود سر سید احمد خان تھے۔ چھ برس میں ۲۲۶ مضمون چھپے جن میں چھوٹے بڑے ۱۱۲ مضمون خود سر سید احمد خان نے لکھے تھے۔ ۱۸۸۱ء میں یہ رسالہ دوسری بار جاری ہوا۔ جو دو برس پانچ ماہ تک جاری رہا۔ اس بار کل ۶۷ مضمون چھپے جن میں ۲۳ مضمون سر سید احمد خان کے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں نواب محسنؔ الملک کی تحریک پر یہ رسالہ سہ بارہ جاری کیا گیا اور تین برس جاری رہ کر بند ہو گیا۔ اس دفعہ چند مضامین کے سوا خالصتاً" تفسیر قرآن شائع ہوتی رہی۔ ۱۸۷۲ء میں خطبات احمدیہ مرتب کئے۔ یہ خطبات سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کے جواب میں شائع کئے گئے تھے۔ ۱۸۸۱ء تا ۱۸۸۶ء تک انہوں نے تفسیر القرآن لکھی۔ جس کی پہلی جلد ۱۸۸۲ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اور اس کے بعد وقتاً" فوقتاً" اس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ مگر افسوس کہ وہ نصف قرآن سے زیادہ تفسیر نہ لکھ سکے۔ اسی دوران ۱۸۸۲ء میں انہوں نے "النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی" لکھی جس میں انہوں نے امام غزالی کی کتاب مضمون بہ علی اہلہ اور مضمون بہ علی غیر اہلہ اور منقدہ من اصلال اور الاقتصاد فی الاعتقاد کے بعض مسائل پر بحث کی۔ اس کتاب میں امام صاحب کی کتاب التفرقہ بین السلام والزندقہ کا ریویو بھی شامل ہے۔ ۱۸۹۲ء میں اصحاب الکہف کے قصہ کی تفسیر "ترقم فی

قصہ اصحاب الکہف والرقیم" لکھی اور ۱۸۹۲ء میں ہی "ازالتہ الغین عن ذی القرنین" جو درحقیقت تفسیر القرآن کا ایک جز ہے لکھی۔ ۱۸۹۲ء میں ایک مختصر رسالہ الدعاء والاستجابتہ اور ایک اور رسالہ "تحریر فی اصول التفسیر" شائع کروایا۔ ۱۸۹۳ء میں آپ نے تفسیر السموات چھپوائی۔

مذکورہ بالا کتابوں اور رسالوں کے علاوہ آپ نے دو کتابیں قانون پر بھی لکھیں۔ ایک کا نام انتخاب الاخوین ہے۔ اور دوسری غدر کے باعث منظرعام پر نہ آسکی۔ اس کے علاوہ آپ نے بے شمار پولیٹیکل اور اخلاقی مضامین علی گڑھ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے شائع کروائے۔

قیام محمڈن کالج علی گڑھ

۱۸۸۵ء سے قبل مسلمانوں کی تعلیمی حالت اتنی کمزور تھی کہ تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوایٹس کی تعداد صرف بیس تھی۔ جن میں ۱۷ بی اے اور ۳ ایم اے تھے۔ جبکہ ہندو گریجوایٹس کی تعداد ۸۴۶ تک پہنچ چکی تھی جن میں ۷۱۵ بی اے اور ۱۳۱ ایم اے تھے۔

آپ کی انتھک کوششوں کے بعد ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء کو ابتدائی محمڈن مدرسہ علی گڑھ میں کھولا گیا۔ ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو اسے کالج کا درجہ دیا گیا اور اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس سال محمڈن کالج فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور ۱۸۸۱ء میں بی اے اور ایم اے کے امتحان تک اور ۱۸۸۳ء سے قانون امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ اور اسی طرح سائنس اور آرٹس کی اعلیٰ تعلیم میں نیز قانونی تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ الحاق ہوا۔ سرسید احمد خان کے اس عظیم کارنامے کی بدولت مسلمانوں کا تعلیمی معیار بہت بہتر ہوا اور وہ ہندوؤں کے برابر آ گئے۔ ان کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔

اعزازات

۱۔ ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ ظفر والیٔ ہند نے موروثی خطاب جواد الدولہ سید احمد خان عارف جنگ عطا کیا۔

۲۔ ۶ر اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا آفس میں ڈیوک آف ارگائل نے سی ایس آئی کا

خطاب اور تمغہ دیا۔

۳۔ ۲۴ر مئی ۱۸۸۸ء کو ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے "نائٹ کمانڈر طبقہ اعلیٰ ستارہ ہند" (کے سی ایس آئی) کا خطاب دیا گیا۔

۴۔ ۱۸ر اپریل ۱۸۸۹ء میں آپ کو اڈنبرا یونیورسٹی کی جانب سے "ڈگری آف ڈاکٹر آف لاز" دی گئی۔

وفات

آپ نے ۲۷ر مارچ ۱۸۹۸ء کو رات دس بجے وفات پائی۔ وصال کے وقت دو قرآنی آیات برابر ان کی زبان پر جاری رہیں۔

۱۔ حسبی اللہ ونعم الوکیل نعم المولی و نعم النصیر

۲۔ ان اللہ وملائکتہ یصلون علے النبی یا ایھا الذین امنوا صلو علیہ وسلموا وتسلیما

آخری مضامین سرسیّد

"سرسیّد احمد خان کے آخری مضامین" خاص کر وہ مضامین جن کی پیشانی پر لفظ "تہذیب الاخلاق" لکھا ہوا تھا، بہت کم احباب نے ان کو دیکھا اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ لہٰذا یہ مضامین بطور خاص کالجوں اور سکولوں کے نوجوانوں کے لیے اکسیرِ اعظم کا سا درجہ رکھتے ہیں۔ ان مضامین سے ان کے نظریات کا بخوبی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

زیرِ نظر مضامین میں دو مضامین "ازواج مطہرات" اور "قوم کی زندگی اور موت" سرسیّد احمد خان نے وفات سے قبل لکھنا شروع کئے تھے۔ لیکن مکمل نہ کر سکے۔ لیکن یہ نا تمام مضامین بھی اپنی ذات میں مکمل ہیں۔

وجہ وجود کائنات

سوال جو پوچھا جاتا ہے اس کا جواب دو طرح سے ہوتا ہے یا تو بتایا جاتا ہے کہ یہ سوال ہی سرے سے غلط ہے یا اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی یہ سوال کرے کہ دس اور پانچ مل کر بیس کیوں ہوتے ہیں۔ تو اس کو جواب دیا جائیگا کہ یہ سوال ہی سرے سے غلط ہے اور اگر کوئی یہ سوال کرے کہ دس اور پانچ ملکر پندرہ کیوں ہوتے ہیں۔ تو اس کا جواب دیا جائیگا کہ پانچ دس کا نصف ہے اور جب اس کو دس میں ملائیں تو ڈیوڑھا ہو جاتا ہے۔ اور پندرہ بھی دس کا ڈیوڑھا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پانچ کو دس میں ملائیں تو پندرہ ہو جاتے ہیں۔ مگر جب کوئی شخص سوال کرتا ہے تو اس بات پر بھی خیال کرنا ضروری ہوتا ہے کہ یہ سوال انسان کے دل میں کیوں پیدا ہوا ہے۔ جب ہم اس سوال پر خیال کرتے ہیں جو پوچھا گیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی مصنوعات کو جب انسان دیکھتا ہے تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں اور کس مقصد سے بنائے گئے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کمہار نے ایک پیالا بنایا تو انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ کیوں بنایا ہے۔ اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ کسی چیز کے رکھنے کو یا کسی رکیک چیز کے پینے کو یہ سوال ایسی حالت میں درست ہوتا ہے جب کہ اس کے بنانے والے کی اور اس کے بنانے کی حقیقت اور ماہیت معلوم ہو۔ لیکن اگر اس کے بنانے والے کی اور اس کے بنانے کی حقیقت اور ماہیت معلوم نہ ہو۔ تو اس وقت یہ سوال درست نہیں ہوتا۔ بلکہ غلط ہوتا ہے کیونکہ جو منشاء اس قسم کے سوال کا بنانے والے کے حالات معلوم ہونے سے انسان میں پیدا ہوتا ہے وہ منشا خدا کی نسبت صادق نہیں آتا۔ کیونکہ خدا کی اور اس کی صنعت کی حقیقت اور ماہیت معلوم نہیں ہے بلکہ اس کا جاننا۔ فطرت انسانی سے خارج ہے۔ پس خدا کی اور خدا کے کاموں کی حقیقت اور ماہیت معلوم نہیں ہے۔ اور اسی لئے یہ سوال خدا کی نسبت کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ غلط ہے۔ پس اس کا جواب یہی ہے کہ یہ سوال عقلاً نہیں ہو سکتا کہ خدا نے یہ تمام کائنات کیوں اور کس مقصد سے پیدا کی ہے۔ یہ تو سوال کے غلط ہونے کی عقلی دلیل ہے۔ لیکن اگر ہم مذہب کی رو سے جواب دینا چاہیں تو صرف ہم کو اس قدر کہنا کافی ہے کہ خدا نے قرآن مجید میں فرما دیا لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون۔

اگر ہم زیادہ عام فہم طور پر اس سوال کا جواب بیان کرنا چاہیں تو یوں کہیں کہ کمہار

جس نے مٹی کے کھلونے بنائے ہیں۔ کسی کو ہاتھی بنایا ہے، کسی کو گھوڑا، کسی کو شیر، کسی کو بکری، کسی کو بلی، کسی کو چوہا، کسی کو لنگڑا کسی کو لولا تو کیا مٹی اس سے پوچھ سکتی ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا ہے پس انسان کی کیا مجال ہے کہ خدا کی نسبت ایسا سوال کر سکے۔

ہاں خدا نے بہت جگہ قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہماری عبادت کرے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے۔ ما خلقت الجنّ والانس الاّ یعبدون۔ پس مسلمانوں کو اس کے مطابق خدا کی عبادت جس طرح کہ خدا نے عبادت کا حکم دیا ہے۔ عبادت کرنی چاہیئے اور اگر کوئی غیر مذہب والا جو قرآن مجید کو نہیں مانتا۔ اس کی وجہ دریافت کرنی چاہے تو ہم عقلاً بخوبی ثابت کر سکتے ہیں۔ کہ انسان کی نیچر جس پر خدا نے اس کو مخلوق کیا ہے۔ اسی کا مقتضی ہے مگر یہ بحث بہت طویل ہے اور بقول ایک دانش مند شخص کے ٹیبل ٹاک میں اس کے بیان کی گنجائش نہیں۔

العجب ثم العجب

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تفہیمات الٰہیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "خدا نے معاون پر نظر رحمت ڈالی۔ جو عناصر کے ٹکرانے اور ملنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اور ان سے کہا کہ میں نے تجھ سے اپنا رب ہونا ظاہر کیا۔ تجھ کو میں نے اپنی خلق سے برگزیدہ کیا ہے۔ جو کچھ میں نے پیدا کیا ہے۔ تیرے لئے ہے اور آسمان اور زمین کو تیرا تابعدار بنایا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ معدنیات سے کہتا رہا۔ یہاں تک کہ پہلا دور ختم ہو گیا۔

پھر معدنیات کی صورت خدا کے سامنے حاضر ہوئی۔ اور خدا کے سامنے عجز و نیاز کرنے لگی۔ تو خدا کی بارگاہ سے ایک فیض عجیب معدنیات کی صورت پر پڑا۔ کہ اس میں تغذیہ کا اور نمو کا استعداد پیدا ہو گیا۔ اور نباتات پیدا ہو گئیں۔ اور معدنیات کی صورت پر غالب آئیں۔ اور معدنیات اس میں چھپ گئیں اور خدا کی شان دوسری ہو گئی۔

پھر خدا نے نباتات پر نظر رحمت ڈالی اور کہا کہ جو کچھ میں نے پیدا کیا ہے تیرے لئے ہے۔ میری خلقت میں سے تو ہی برگزیدہ ہے۔ اور تو ہی میرا مقصود ہے۔ اور تمام عالم تیری تابع ہیں۔ اسی طرح خدا تعالی معدنیات سے کہتا رہا۔ یہاں تک کہ دورہ ختم ہو گیا۔ یعنی دوسرا دور۔

پھر نباتات کی صورت خدا کے سامنے حاضر ہوئی۔ اور عجز نیاز کرنے لگی تو خدا کی بارگاہ سے ایک فیض عجیب نباتات کی صورت پر پڑا۔ کہ اس میں ادراک اور حس۔ اور ارادہ کی قوت پیدا ہو گئی۔ اور اس سے حیوان پیدا ہو گئے۔ اور معدنیات اور نباتات اس میں چھپ گئیں۔ اب خدا نے حیوان پر نظر رحمت کی اور کہا۔ کہ جن کو میں نے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے تو ہی میرا برگزیدہ اور تو ہی میرا محبوب ہے۔ اور تو ہی میرا مطلوب اور تو ہی عالم کے پیدا ہونے کا سبب ہے اور تو ہی خلق کے پیدا ہونے کی علت فاعلی ہے۔ پھر اسی طرح خدا اس سے کہتا رہا۔ یہاں تک کہ دور ختم ہو گیا۔ یعنی تیسرا دور۔

پھر حیوانات کی صورت خدا کے سامنے حاضر ہوئی۔ اور عجز و نیاز کرنے لگی۔ تو خدا کی طرف سے انسان کی صورت اس پر فائز ہوئی۔ پھر اس میں اس سے افضل استعداد پیدا ہو گیا۔ جو ان میں تھا۔ اور اصل صورت انسان کے دل اور عقل کے لطیفہ کا پورا ہونا ہے۔ پھر انسان کی نوع پیدا ہوئی۔ جن میں سب سے پہلے آدم علیہ السلام ہیں۔ اور خدا نے رحمت کی

نظر سے اس کو دیکھا اور کہا۔ کہ تو عالم صغیر ہے خبر دینے والا عالم کبیر کا۔ تو ہی امانت کے لائق ہے۔ نہ آسمان اور نہ زمینیں اور نہ پہاڑ۔ عالم کو تیرے لئے مسخر کیا ہے۔ اور تیرے لئے مینہ برسایا ہے۔ اور نباتات اگائے۔ اور تیرے لئے حیوانوں کو زمین میں پیدا کیا۔ میری خلقت میں تو ہی میرا محبوب ہے (انتہی) گویا یہ چوتھا دور تھا۔

شاید اسی مقام کے مناسب حافظ علیہ الرحمتہ نے فرمایا ہے۔

آسماں بار امانت نتو السنت کشید

قرعہ فال بنام من دیوانہ زوند

قال اللہ تعالی۔ انا عرضنا الامانۃ علی السموٰت والارض والجبال فابین ان یحملھا واشفقن منھا۔ وحملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا (۲۳ آیت ۷۲ سورہ الاحزاب)

یعنی ہم نے پیش کیا امانت کو آسمانوں اور زمینوں کے اور پہاڑوں کے سامنے۔ پھر انہوں نے اس کے برداشت کرنے سے انکار کیا۔ اور اس سے ڈر گئے۔ اور اس کو برداشت کیا انسان نے۔ بیشک وہ زیادتی کرنے والا اور نادان تھا۔

اس مقام پر ہم کو اس آیت کی نسبت بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ ہر کوئی جان سکتا ہے۔ کہ جو چیز انسان میں حیوانوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ اسی کی نسبت لفظ امانت کا کہا گیا ہے۔ مگر جو کچھ کہ تعجب ہم کو ہے۔ وہ اس بات سے ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ان چاروں دوروں کا ہونا اور خصوصاً اس طرح پر جس طرح پر کہ انہوں نے بیان کیا ہے۔ کہاں سے اخذ کیا ہے۔ جو لوگ کہ ڈارون کی تھیوری کے قائل ہیں وہ تو شاہ ولی اللہ صاحب کے اس بیان سے انقلاب کی تھیوری پر استدلال کرتے ہیں۔ اور جو لوگ انقلاب کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ مماثلت کے قائل ہیں جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔ وہ ان کے بیان سے مماثلت کی تھیوری پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ کہاں سے ان دوروں کا شاہ ولی اللہ صاحب نے استنباط کیا ہے۔ اس وقت تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا ہے۔

البتہ توریت میں ہے۔ کہ زمین نے سبزہ زار اور درختان میوہ دار کو اگایا اور خدا نے ان کو دیکھ کر کہا کہ بہت اچھا ہے۔ پھر خدا نے پانیوں کو کہا۔ کہ پانی کے جانور اور اڑنے والے جانور پیدا کریں۔ اور خدا نے ان کو دیکھ کر کہا کہ بہت اچھا ہے۔

پھر خدا نے زمین کو کہا کہ زمین پر چلنے والے جانور پیدا کرے۔ اس نے پیدا کئے اور خدا

نے ان کو دیکھ کر کہا۔ کہ بہت اچھا ہے۔

پھر خدا نے اپنے مشابہ انسان کو پیدا کیا۔ مگر جو طرز بیان کہ شاہ ولی اللہ صاحب کا ہے۔ اور جو طرز بیان کہ توریت میں ہے وہ یکساں نہیں ہے۔ مگر ہم کو پتہ نہیں لگتا۔ کہ شاہ صاحب نے وہ بیان کہاں سے اخذ کیا ہے۔ اگر انہوں نے بذریعہ اپنے مکاشفہ کے بیان کیا ہے تو اس میں کچھ کلام نہیں۔ اور اگر انہوں نے کتاب اور سنت سے اخذ کیا ہے۔ تو ہم کو امید ہے کہ کوئی دوست ہم کو اسکے ماخذ سے مطلع فرماوے گا۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۰ء

منتہی الکلام فی بیان مسائل الاسلام

جو لوگ مذہب اسلام کی مخالفت اور اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں وہ زیادہ تر ان کتابوں پر متوجہ ہوتے ہیں۔ جو کتب احادیث و تفاسیر و کتب سیر کے نام سے مدون ہیں۔ اور جن کو خود اہل اسلام نے لکھا ہے۔ اور جب کوئی مسلمان ان احادیث کی تنقیح کرتا ہے اور کسی کو مقبول اور کسی کو مردود قرار دیتا ہے۔ یا تفاسیر اور سیر کی کتابوں کے مضامین کو غلط ٹھہراتا ہے۔ تو اس پر مذہب اسلام کی طرف داری کا الزام لگاتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا کتابوں میں ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو

(۱) خود قرآن مجید کے بھی برخلاف ہیں اور

(۲) ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو تاریخ محققہ اور مشہورہ کے متناقض ہیں اور

(۳) ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کو حس اور مشاہدہ جھٹلاتا ہے اور

(۴) ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کو عقل انسانی کسی طرح قبول نہیں کرتی۔ اس قسم کی روایتوں سے جو مسلمان انکار کرتے ہیں اور ان کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ اس سے ان کا صاف مطلب یہ پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی صداقت ظاہر کرنے کو اس کے مخالف جو حدیثیں اور روایتیں ہیں اس سے انکار کریں اور تاریخ محقق اور مشہورہ اور حس اور مشاہدہ اور عقل انسانی کے برخلاف جو حدیثیں اور روائتیں ہیں۔ اس سے اسلئے انکار کرتے ہیں کہ مذہب اسلام پر کوئی حرف نہ آنے پائے اور تعجب یہ ہوتا ہے کہ

(۵) ایسی حدیثوں اور روایتوں کو جن سے بانئے اسلام کے مناقب پائے جاویں تسلیم کرتے ہیں۔ اور جن سے بانئے اسلام پر کسی قسم کی منقصت لازم آتی ہے۔ اس کو نہیں مانتے۔

(۶) اور جو حدیثیں اور روایتیں وقار نبوت کے برخلاف ہیں ان کو بھی نہیں مانتے اور کوئی عقلی دلیل اس بات کی نہیں بیان کر سکتے کہ کیوں ان حدیثوں اور روایتوں کو مانا ہے اور کیوں ان روائتوں اور حدیثوں کو نہیں مانا۔ اگر اس ماننے اور نہ ماننے کی بنا عقائد مذہبی پر ہے تو وہ شخص جو مذہب اسلام کو نہیں مانتا قبول نہیں کر سکتا بلکہ ان کے ماننے اور نہ ماننے

کے لئے ایسی عقلی اور روشن دلیل چاہئے جس کو غیر مذہب والا بھی مان سکے۔

یہ قول تو مخالفین مذہب اسلام کا ہے مگر ہم اس پر یہ اور زیادہ کرتے ہیں کہ جب کسی راوی کی ایک روایت یا کسی حدیث کی کتاب کی کوئی حدیث یا کسی محدث یا مفسر یا عالم یا مجتہد کے قول کو صحیح مانا جاتا ہے تو جب اسی راوی کی دوسری روایت یا اسی حدیث کی کتاب کی دوسری حدیث یا اسی مفسر یا محدث یا عالم یا مجتہد کے دوسرے قول کو غلط قرار دیا جاتا ہے۔ تو خود مسلمان ہی معترض ہوتے ہیں کہ کیوں اس راوی کی روایت اور اس حدیث کی کتاب کی حدیث کو اور محدث یا مفسر یا عالم یا مجتہد کے قول کو صحیح مانا تھا۔ اور اب کیوں اسی راوی کی روایت اور اسی حدیث کی کتاب کی حدیث اور اس محدث یا مفسر یا عالم یا مجتہد کے دوسرے قول کو غلط مانا جاتا ہے۔

ہم ان امور کی نسبت جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی بنیاد عقائد مذہبی پر رکھنی نہیں چاہتے بلکہ ایسے عام واقعات پر مبنی کرنا چاہتے ہیں کہ جن سے ہماری دانست میں کوئی انسان انکار نہیں کر سکتا۔

یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جو واقعہ کسی زمانہ میں گذرتا ہے بشرطیکہ وہ واقع ایسا ہو کہ آئندہ زمانہ کے لوگ اس کے تذکرہ میں مشغول رہتے ہوں۔ اور اس کا چرچا قائم رکھتے ہوں۔ تو جس قدر زمانہ گذرتا جاتا ہے۔ اسی قدر اس میں زائد باتیں جو اس واقع میں درحقیقت نہیں ہوئیں ملتی جاتی ہیں۔ دنیاوی واقعات میں ایسا کم ہوتا ہے بلکہ نہیں ہوتا کہ آئندہ زمانہ کے لوگ مدت دراز تک اس کے تذکرے اور چرچے میں مشغول رہتے ہوں۔ اور یہی سبب ہے کہ تاریخانہ واقعات میں جو بادشاہوں اور سلطنتوں اور ملکوں کے حالات میں لکھے جاتے ہیں۔ ایسی زائد اور بے اصل باتوں کا میل کمتر ہوتا ہے۔ مگر واقعات مذہبی ایسے قسم کے ہوتے ہیں جن کا تذکرہ اور چرچا زمانہ دراز تک قائم رہتا ہے۔ بلکہ برابر چلا جاتا ہے۔ اس لئے زائد اور بے اصل باتیں ان واقعات میں شامل ہوتی جاتی ہی۔ مذہب اسلام بھی اس عام قاعدہ سے بری نہیں رہا بلکہ اس میں ایسے اسباب پیش آئے کہ اس میں زائد اور بے اصل باتوں کے شامل ہونے کے زائد اسباب تھے۔

رسول خدا (صلے اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد جہاں تک ان واقعات کا جو آنحضرات کے زمانہ میں گذرے۔ اور ان اقوال و افعال کا جو آنحضرتؐ نے فرمائے یا کئے

سب کا زبانی روائتوں پر مدار تھا اور اس میں زائد بے اصل باتوں کے شامل ہونے کے بہت سے اسباب موجود تھے۔

اول۔ امتداد زمانہ ہی اس بات کا مقتضی تھا کہ زائد اور بے اصل باتیں اس میں شامل ہوتی جاویں۔

دوم۔ ان باتوں کو گو وہ زائد اور بے اصل ہی ہوں۔ لوگ زیادہ پسند کرتے تھے جن سے تقدس اور تفوق آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مترشح ہوتا تھا۔

سوم۔ جو راوی اس زمانہ کے واقعات کو یا آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو روایت کرتے تھے۔ وہ نہایت مقدس معزز و مکرم لائق ادب سمجھے جاتے تھے جس نے بہت لوگوں کو صحیح و غلط روایت کرنے پر اور موضوع و بے اصل روایت بنا لینے پر راغب کیا تھا۔

چہارم۔ راویوں کا ان واقعات کے اسباب کے سمجھنے میں جن کے سبب سے وہ واقعات پیش آئے تھے۔ غلطی کرنا اور اس کا ایسا سبب قرار دینا جو واقعی نہ تھا۔

پنجم۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا اس کے مطلب اور مقصد اور منشاء کے سمجھنے میں غلطی کرنا اور اس کا ایسا مطلب قرار دینا جو مقصود نہ تھا۔

ششم۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری بات سنی بغیر صرف اسی قدر کو روایت کر دینا جس قدر کہ ادھوری بات سنی تھی۔

ہفتم۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں اور عیسائیوں اور عرب جاہلیت کے حالات اور عقائد یا واقعات کا بھی تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ مگر سننے والے نے یہ سمجھا کہ ان باتوں کو خود رسول خدا صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اس کو آنخضرت کے فرمودہ کے طور پر روایت کر دیا۔

ہشتم۔ ایک غلط افواہ کا لوگوں میں مشہور ہو جانا۔ اور پھر اس کا بطور روایت کے بیان ہونا۔

نہم۔ آپس میں تنازعات کا ہونا۔ اور ہر ایک گروہ کا اپنے مقصد کے موافق روایتوں کا بنانا۔ اور روایت کرنا۔

دہم۔ مختلف عقائد پر لوگوں کا ہو جانا۔ اور اپنے اپنے عقائد کی تائید میں روایتوں کا

بیان کرنا۔

یازدہم۔ بددیانت لوگوں کا امراء و سلاطین کے خوش کرنے کو جھوٹی روایتوں کا بیان کرنا۔

دوازدہم۔ منافقین اور مخالفین مذہب کا جھوٹی روایتوں کو شائع کرنا۔ یا اصلی روایتوں میں کمی و بیشی کر دینا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک مدت دراز تک زبانی روایت کا سلسلہ جاری رہا۔ اور اس وقت منقطع ہوا۔ جب کہ معتدبہ کتابیں حدیث کی لکھی گئیں مگر اس بات کو فراموش کرنا نہیں چاہئے کہ جس قدر حدیث کی کتابیں لکھی گئیں ان کی بنیاد انہیں زبانی روایتوں پر مبنی تھی۔

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ محدثین نے خدا ان پر رحمت کرے جہاں تک کہ ان سے ہو سکا کسی نے کم اور کسی نے بہت زیادہ اس بات میں کوشش کی کہ صحیح روایتوں کو اپنی کتاب میں جمع کریں۔ چنانچہ موطا امام مالک اور بخاری و مسلم نے اور اس کے بعد ترمذی۔ سنن ابوداؤد۔ سنن نسائی اور ابن ماجہ نے اس میں بہت کامیابی حاصل کی اور علما نے ان کتابوں کو قبول کیا اور ان کی شرح لکھنے اور مقامات مشکلہ کے حل کرنے میں متوجہ ہوئے۔

ان کی کوشش کا زیادہ تر بلکہ بالکلیہ راویوں کے معتبر اور نامعتبر ہونے پر مدار تھا مگر جن لوگوں کو مرے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا تھا ان کے معتبر یا نامعتبر ہونے کو اس طرح پر تحقیق کرنا جس پر یقین کامل ہو اگر ناممکن نہ تھا تو نہایت مشکل ضرور تھا۔ مگر اس حدیث کے مضامین کے لحاظ سے اس کے صحیح یا غیر صحیح ہونے پر ان لوگوں کو کچھ خیال نہ تھا۔

اس زمانہ میں جس قدر مذاہب موجود تھے کیا یہودی اور کیا عیسائی اور کیا آتش پرست اور کیا بت پرست سب کے سب سپر نیچرل یعنی مافوق الفطرت واقعات کے واقع ہونے کے قائل تھے اور یہودی اور عیسائیوں میں ایسے واقعات کثرت سے مشہور تھے اور مسلمان خدا کو قادر مطلق یقین کرتے تھے۔ جس سے ان کا یہ مقصد تھا کہ خدا ایسے امور کے کرنے پر بھی مختار ہے جو مافوق الفطرت کا بیان ہوتا تھا۔ ان کو بلا کسی شبہ اور تردّد کے حدیث کی کتابوں میں داخل کر لیا جاتا تھا۔ غرضیکہ تمام کتب احادیث اور بالتخصیص کتب تفاسیر اور سیر اس قسم کی روایات کا مجموعہ ہیں۔ جن میں صحیح اور غیر صحیح اور قابل تسلیم اور ناقابل تسلیم حدیثیں اور

روایتیں مندرج ہیں۔

یہ سب باتیں جو ہم نے بیان کیں تاریخانہ واقعات ہیں جو اسلام پر گذرے ہیں اور کوئی بات اس میں ایسی نہیں ہے کہ سوائے معتقدین اسلام کے اور کوئی اسکو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی شخص کسی مذہب کا ہو بشرطیکہ وہ تاریخی واقعات سے واقف ہو۔ ان واقعات کے صحیح ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایک محقق کو جو یہ چاہتا ہو کہ ان حدیثوں اور روایتوں میں سے صحیح کو غیر صحیح کی تمیز کرے عقلاً بغیر پابندی مذہب کے کیا کرنا لازم ہے؟ عقل یہ حکم کرتی ہے کہ سب سے اول اس کا یہ کام ہوگا کہ اسی زمانہ کی ایسی تحریر کو تلاش کرے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہو لکھا ہو۔ تاکہ اس سے ان زبانی روایتوں کا مقابلہ کرے اور جس زبانی روایت کو اس تحریر کے مخالف یا متناقض پاوے اسکو غلط قرار دے۔

ایسی تحریر بجز اس کتاب کے جس کو مسلمان قرآن مجید کہتے ہیں اور کوئی نہیں ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید اس زمانہ کے رواج کے موافق لکھا جاتا تھا۔ اور وہ متفرق چیزوں پر لکھا ہوا تھا۔ بعد انتقال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابو بکرؓ کی خلافت میں ایک جا جمع ہوا۔ جس میں بہت سے اقوال اور احکام رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اور چند واقعات جو اس زمانہ میں واقع ہوئے مندرج ہیں۔ نعوذ باللہ اس کو کتاب منزل من اللہ نہ مانو۔ مگر کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور کم سے کم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ پس اگر کوئی زبانی روایت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی ہو۔ اور اس کتاب کے اقوال اور احکام اور واقعات مندرجہ کے خلاف یا متناقض ہو تو بلا لحاظ مذہب عقل اس بات کی مقتضی ہے کہ اس زبانی روایت کو غلط سمجھا جاوے اور مذہب اسلام میں سے اس کو اسی طرح نکال کر پھینک دیا جاوے جس طرح دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے۔ اور یہی عقلی اصول مذہب اسلام میں ٹھہرا ہے کہ جو حدیث یا روایت قرآن مجید کے برخلاف یا اس کے متناقض ہو۔ اس کو نامقبول اور مردود کیا جائے پس ہمارا ایسا کرنا اس مطلب سے نہیں ہے۔ کہ قرآن مجید کی

صداقت میں (جو ہمارے نزدیک بلا شبہ صادق ہے) کچھ فرق نہ آوے بلکہ ہر انسان ایسا ہی کریگا جیسا کہ ہم کرتے ہیں۔

ایسا کرنے میں ہم نے قرآن مجید کے ساتھ کوئی عجیب کام نہیں کیا۔ بلکہ ایسا ہی کام کیا ہے۔ جو عموماً ایسی حالت میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے پاس تزک تیموری۔ تزک بابری۔ تزک جہانگیری۔ جو خود ان بادشاہوں کی لکھی ہوئی ہیں یا ایسی تاریخیں جو ہم عہد مصنفوں نے لکھی ہیں موجود ہیں۔ اب ہم کو ایک زبانی روایت پہنچی۔ جو بالکل مخالف یا متناقض ان حالات کے ہے جو ان کتابوں میں مندرج ہیں۔ تو ہم بلاشبہ اس زبانی روایت کو غلط اور مردود قرار دینگے۔ پس کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کے مقابلہ میں ایسی زبانی حدیث یا روایت کو جو قرآن مجید کے مخالف یا متناقض ہے مردود اور نامقبول نہ قرار دیں۔ پس یہ خیال کہ ہم قرآن مجید کی صداقت قائم رکھنے کو ان زبانی روایتوں سے انکار کرتے ہیں۔ کیسا لغو اور بے ہودہ اور بے اصل خیال ہے۔

دوسرے امر کی نسبت ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں تو کوئی ایسی بات جو تاریخ محققہ اور مشہورہ کے برخلاف ہو۔ پائی نہیں جاتی۔ ہاں اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بعض قصص جو یہودیوں اور عیسائیوں میں یا عرب جاہلیت میں مشہور تھے۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ مگر جو فضول اور زائد اور بے اصل باتیں ان قصص مشہور میں شامل تھیں اور جو عقلاً بھی غلط معلوم ہوتی تھیں۔ وہ قرآن مجید میں نہیں ہیں۔ گو کہ مفسروں نے اپنی تفسیروں میں ان کو بھی داخل کرلیا ہو۔

باقی رہیں وہ حدیثیں اور روایتیں جو زبانی بیان پر مبنی ہیں۔ اگر کسی تاریخ محققہ کے برخلاف ہیں تو یہ برخلافی ان کے نامعتبر ہونے کی دلیل کافی ہے اور وہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کی گئی ہیں۔ تو اول اس بات کا کافی ثبوت ہونا چاہئے۔ کہ درحقیقت اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ دوم اس بات کا ثبوت چاہئے کہ جو لفظ راویوں نے بیان کئے ہیں وہی لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے تھے تیسرے اس بات کا ثبوت چاہئے کہ جو معنی ان لفظوں کے شارحین و مفسرین نے بیان کئے ہیں ان کے سوا اور کوئی معنی ان کے نہیں ہیں۔ اور اگر ان میں کوئی ایک امر بھی نہیں ہے تو اس روایت کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

تیسرے امر کی نسبت ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم کو کوئی ایسی حدیث جس کو صحیح طور پر حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کہہ سکیں معلوم نہیں ہے جو حس اور مشاہدہ کے برخلاف ہو۔ اور اگر کوئی روایت ایسی ہو اور اس کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کیا ہو۔ تو جب تک وہ تینوں امر ثابت نہ ہوں جن کا ابھی ہم نے بیان کیا ہے اس وقت تک اس کو حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہہ سکتے۔ پس یہ خیال کرنا کہ ایسی روایتوں سے ہمارا انکار کرنا اس لئے ہے کہ مذہب اسلام پر کوئی حرف نہ آنے پائے کس قدر غلط اور ناواجب ہے۔

چوتھے امر کی نسبت ہم یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ حدیث کی کتابوں میں ایسی حدیثیں مندرج ہیں جو عقل انسانی کے برخلاف یا مافوق الفطرت ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ لوگ واقعات مافوق الفطرت کے واقع ہونے کو تسلیم کرتے تھے جیسا کہ اور تمام مذاہب کے معتقد بھی اس کو تسلیم کرتے تھے پس یہ اعتراض ایسا عامتہ الورود ہے کہ کوئی شخص جو کسی مذہب کا معتقد ہو۔ خواہ یہودی مذہب کا خواہ عیسائی مذہب کا یا اور کسی مذہب کا اس اعتراض سے بچ نہیں سکتا۔ لیکن جب کوئی محقق بنظر تحقیق ان پر نظر ڈالتا ہے تو کہتا ہے کہ ان کا مافوق الفطرت یا خلاف عقل ہونا اس کے نامعتبر اور ناقابل قبول ہونے کو کافی ہے۔

خود علمائے علم حدیث نے احادیث موضوع کے امتیاز کرنے کو جو قاعدے بنائے ہیں۔ ان میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جس حدیث میں ایسے امور مذکور ہوں جو مافوق الفطرت یا خارج از عقل ہوں تو وہ حدیث نامعتبر اور موضوع ہے۔ مگر محدثین اس قاعدہ کو ان حدیثوں پر جاری نہیں کرتے جو کتب مشہور احادیث میں اور خصوصاً ان سات کتابوں میں مندرج ہیں۔ جن کے نام اوپر بیان ہوئے ہیں۔ مگر ایک محقق اس بات کی کوئی وجہ نہیں پاتا کہ کیوں اس قاعدہ کو ان حدیثوں کی کتابوں پر جاری نہ کیا جاوے۔ اگر ان امور سے قطع نظر کی جاوے تو انہیں تینوں باتوں کا ثبوت درکار ہوگا جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ یعنی یہ کہ درحقیقت اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ اور جو لفظ راویوں نے بیان کئے ہیں وہی لفظ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے اور جو معنی ان لفظوں کے شارحین اور مفسرین نے اختیار کئے ہیں ان کے سوائے اور کوئی معنی ان لفظوں کے نہیں ہیں۔ اگر ان میں سے پہلی دو باتیں ثابت نہ ہو سکیں تو اس کو حدیث رسول مقبول صلی اللہ

علیہ وسلم قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اگر تیسری بات ثابت نہ ہو سکے تو محقق ان معنوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ جو شارحین اور مفسرین نے قرار دئیے ہیں۔ پس ایسی حدیثوں سے انکار کرنے پر یہ کہنا کہ اس لئے ان سے انکار کیا گیا ہے کہ مذہب اسلام پر کوئی حرف نہ آنے پاوے۔ کیسا غلط اور بے جا اعتراض ہے۔

پانچویں امر کی نسبت ہم یہ کہتے ہیں کہ جن حدیثوں یا روایتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب بیان ہوتے ہیں وہ خود تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں ہوتا۔ صحابہ کے اقوال ہوتے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہے ہیں پس جو کچھ ان میں بیان ہوا ہے وہ رائے ان بیان کرنے والوں کی ہے پس کسی کو حق نہیں ہے کہ یہ کہے کہ یہ رائے اس بیان کرنے والے کی نہیں ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ وہ حدیثیں بطور اس راوی کی رائے کے تسلیم کی جاویں۔

حدیث یا تفسیر یا سیر کی کتابوں میں ہم کوئی روایت ایسی نہیں پاتے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ منقصت کی ہو۔ یا کسی شخص نے جو آنحضرت کی رسالت اور اسلام کی حقیقت کا مقر ہو ایسی روایت بیان کی ہو۔ اور اس لئے یقین ہوتا ہے کہ ایسی روایت کا بیان کرنا صرف دو شخصوں کا کام ہے یا منافقوں کا یا کافروں کا۔ اور ظاہر ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں بہ سبب نفاق اور کفر کے جو مورث عداوت ہے کہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس کو مردود سمجھا جائے۔ ایسا کرنے میں ہم قاعدہ طبیعت انسانی سے کچھ زیادہ نہیں کرتے۔ کیونکہ اس زمانہ میں بھی اگر کوئی کسی کا دشمن یا مخالف اس کی نسبت کوئی بات منقصت کی کہتا ہے تو اس کو نہیں مانا جاتا۔ اور یقین کیا جاتا ہے کہ دشمنی اور عداوت کی وجہ سے کہتا ہے پس ایسی بات کے تسلیم نہ کرنے میں ہم عام طبیعت انسانی سے کچھ زیادہ نہیں کرتے۔

چھٹے امر کی نسبت ہم یہ کہتے ہیں کہ ہاں ہم ایسی روایتوں کو بھی نہیں مانتے جو وقار نبوت کے برخلاف ہوں۔ ایسا کرنے میں بھی ہم عام طبیعت انسان کے برخلاف نہیں کرتے۔ کیونکہ ہم نے بہت سی قطعی دلیلوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل ترین خلق تسلیم کرلیا ہے اور رسول خدا بھی مانا ہے تو ایسے امور کو جو اس وقار کے برخلاف ہوں۔ ہرگز تسلیم نہیں کرتے ایسا کرنے میں بھی ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتے جو عموماً کیا کرتے ہیں۔

اس زمانہ میں بھی جس شخص کو ہم عمدہ خصلت اور صاحب دیانت ذی وقار سمجھ لیتے ہیں تو اگر کوئی شخص ایسا امر بیان کرے جو اس کے وقار کے شایاں نہ ہو۔ تو اس کو بھی ہم تسلیم نہیں کرتے۔ پس اگر ہم نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی ایسا کیا تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔

محدثین نے حدیث کے روایت کرنے میں تین لفظ اختیار کئے ہیں۔ اخبرنا اور ابنانا۔ اور عن پہلے دو لفظ تو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ پچھلے راوی نے پہلے راوی سے خود وہ روایت سنی ہے۔ مگر عن کے لفظ سے یہ لازم نہیں ہے کہ پچھلے راوی نے پہلے راوی سے وہ روایت سنی ہو۔ اور ممکن ہے کہ نہ سنی ہو۔ بلکہ اس پچھلے راوی اور اس کے اوپر کے راوی میں اور لوگ بھی ہوں۔ جن کے نام چھوٹ گئے ہوں۔ اور ایسی بھی حدیثیں ہیں جن کی روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچی۔ بلکہ صرف صحابہ یا تابعین اور تبع تابعین تک پہنچی ہے اگر ایسی حدیثوں میں ایسے مضمون ہوں جن پر کوئی جرح وقدح نہیں ہو سکتی۔ یعنی ازروئے درایت کے وہ مضمون غلط نہیں معلوم ہوتے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان حدیثوں کے قبول کرنے سے انکار کریں۔

تفسیروں اور سیر کی کتابوں میں خواہ وہ تفسیر ابن جریر ہو یا تفسیر کبیر وغیرہ اور خواہ وہ سیرت ابن اسحٰق ہو خواہ سیرت ابن ہشام اور خواہ وہ روضۃ الاحباب ہو یا مدارج النبوۃ وغیرہ ان میں تو اکثر ایسی لغو اور نامعتبر روایتیں اور قصے مندرج ہیں جن کا نہ بیان کرنا ان کے بیان کرنے سے بہتر ہے۔

احادیث

جناب عالی!

ایک مدت دراز سے مذہب علماء و عام اسلامیاں کا اقوال امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ مالک رضی اللہ عنہ و شافی رضی اللہ عنہ واحمد رحمہم اللہ تعالی پر چلا آتا تھا۔ اور اہل علم اپنے اپنے آئمہ کی تائید کرتے۔ اور عمل قرآن و حدیث جو اصلی اسلام ہے مفقود تھا۔ چونکہ ہر کام وقت پر موقوف ہوتا ہے۔ مولنٰنا محمد اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ دہلوی نے تا بمقدور بیخ کنی شرک و بدعت میں کوشش کر کے جو تمام ہندوستان و پنجاب میں جا بجا پھیلا ہوا تھا۔ عمل قرآن و حدیث جاری کر دیا۔ اور جناب کو بھی بذریعہ اسی خاندان عالی کے یہ سعادت نصیب ہوئی۔ اور بعد میں عین مصیبت کے وقت جو امداد اہل حدیث کو جناب نے دی۔ وہ میرے نزدیک جناب کی نجات کے واسطے کافی ہو گی۔ مگر ایک بات تعجب اور حیرانی کی جو میرے دماغ کو چکر میں رکھتی ہے یہ ہے کہ جو آرٹیکل زبان درفشان سے تہذیب الاخلاق میں مشتہر ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسے برخلاف حدیث کے ہوتے ہیں۔ جن سے پرلے درجہ کی بے اعتباری حدیث کی پائی جاتی ہے۔ اور اکثر معتقدین جناب کے تاثیر مضامین حضور والا سے بروقت پیش کرنے حدیث کسی اہل علم کے اس قسم کی تحقیر و تخفیف و انکار کرتے ہیں کہ گویا ان کے نزدیک ایک پوچ بات بیان کی گئی ہے۔ جب کسی انگریز مورخ کا تذکرہ تعریف بیان ہو تو بڑے ادب اور توجہ سے سنا جاتا ہے اور بعد میں اس کی تعریف بھی ہوتی ہے۔ اب میں جناب سے بڑے ادب سے عرض کرتا ہوں کہ پیغمبر علیہ السلام کا یہی ادب ہے اور اس خیال سے سعادت اتباع سنن جو باعث تقرب الی اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ اور عبادت مسنونہ کی ترک یا تخفیف کسی سلف یا خلف کا مذہب ہے۔ بلکہ اکابران اسلام۔ حسبنا کتاب اللہ و کتاب الرسول پر گئے ہیں۔ اور ہم کو تو آپ بھی ان میں سے نظر آتے ہیں۔ مگر بایں ہمہ بڑے بھاری رکن اسلام کو آپ اکھاڑنا چاہتے ہیں۔ کیا اس عمر میں یادگار آپ کی اچھی ہے کہ آپ ذرا توجہ سے غور فرمادیں۔ کہ فقہ تو بوجہ اقوال علما کے رخصت ہو گئی۔ اور حدیث یوں بذریعہ حضور لٹی گئی۔ اب جزیات اور مجمل کی بابت عبادات و اخلاق میں کیونکر عملدر آمد ہو گا۔ اور تخفیف کلام نبوی کی جواب دہی کس کے ذمہ ہو گی۔ اور بڑے بڑے محدثین نے کیوں خدمت

تالیف حدیث کا عمل لغو کیا- اگر کوئی بات میری جہالت سے گستاخی کی نکل گئی ہو- تو معاف فرما کر جواب سے سرفراز فرمادیں-

راقم بندہ میراں بخش از گجرات- ۷ اگست ۱۸۹۷ء

جواب

مخدومی مکرمی شیخ میراں بخش صاحب!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۷ اگست ۱۸۹۷ء پہنچا- آپ کی عنایت اور مہربانی کا ممنون ہوا- آپ نے جو شبہ ارقام فرمایا ہے وہ بلاشبہ ہر ایک مسلمان کے دل میں گذرتا ہو گا- اور میں خوش ہوں کہ آپ کے دل میں بھی یہ شبہ گذرا- مگر ہر ایک مسلمان دل سے یقین رکھتا ہے کہ اس کو خدا اور رسول کی اطاعت فرض ہے- اور ہر ایک شخص سمجھتا ہے کہ خدا کی اطاعت تعمیل احکام قرآن مجید میں اور رسول کی اطاعت اس کے اقوال اور افعال کی پیروی ہے- جو حدیثوں میں پائی جاتی ہیں- منحصر ہے- قرآن مجید کو باللفظ خدا کا کلام ہونے اور واجب التعمیل ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے- پس قرآن مجید تو بموجب مذہب مسلمانوں کے ایک امر مسلم ہے جس میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا- باقی رہی حدیث- اس بات میں تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ احادیث قریبا کل کے بالمعنی روایت ہوئی ہیں نہ باللفظ یعنی ان کے الفاظ بعینہ وہ نہیں جو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے- بلکہ جو کچھ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو- اس مضمون کو راویوں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے- پس احادیث میں دو امر کی تنقیح لازم آتی ہے اول یہ کہ جو کچھ حدیث میں بیان ہوا ہے وہ درحقیقت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا- دوم یہ کہ جو الفاظ ان حدیثوں میں بیان کئے گئے ہیں- وہ اسی مضمون اور مفہوم کو ادا کرتے ہیں- جو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا-

تیسری ایک اور بات بھی ہے کہ جو قصص اور حکایات یہودیوں اور عیسائیوں یا اوروں کے مشہور تھے- اور ان کو راویوں نے خواہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے یا اور کسی سے سنا اور یہ سمجھ کر کہ یہ اصلی فرمودہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے- آنحضرت صلے اللہ علیہ

وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے یا نہیں۔ غرض کہ احادیث خواہ بخاری کی ہوں خواہ مسلم کی قرآن مجید کے برابر نہیں ہیں۔ اور ان کے بجز ظن کے کوئی امر یقینی پیدا نہیں ہوتا۔ پس ہر ایک مسلمان کا کام ہے کہ جہاں تک اس سے ہو سکے احادیث کی سعی اور کوشش کریں۔ محدثین کے حالات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کے جمع کرنے میں بے انتہا کوشش کی ہے۔ خداوند ان کو جزائے خیر دے۔ مگر سب کا دارومدار یہاں تک کہ بخاری اور مسلم کا بھی۔ راویوں کے معتمد اور غیر معتمد سمجھنے پر رہا ہے۔ جس راوی کو انہوں نے معتبر سمجھا۔ اس کی حدیث کو معتبر جانا اور جس راوی کو نامعتبر سمجھا اس کی حدیث کو معتبر نہ جانا۔ مگر یہ بات غور کرنے کی ہے کہ صحیح بخاری ہو یا موطا امام مالک کی ان میں رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم تک تین۔ تین۔ چار چار راوی ہیں۔ اور حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے یا محمد اسمٰعیل بخاری نے اس راوی کے سوا جس نے وہ حدیث نقل کی۔ اوپر کے راویوں کو نہیں دیکھا تھا۔ پس اس بات پر یقین کرنا کہ تمام راوی معتمد تھے۔ اور نیز انہوں نے اس مضمون کے بیان کرنے میں کچھ غلطی نہیں کی نہایت مشکل ہے۔ علاوہ اس کے اسماء رجال کی جو کتابیں ہیں وہ اور مشکلات پیدا کر دیتی ہیں۔ یعنی ایک کتاب میں ایک راوی کو معتبر لکھا ہے۔ اور دوسری کتاب میں اسی راوی کو نامعتبر۔ پس ہم کو اس بات کے کہہ دینے سے کہ راوی اس کے معتبر ہیں کوئی طمانیت اور یقین نہیں ہو سکتا۔ حدیثوں کے جانچنے اور صحیح قرار دینے کے لئے ظاہراً یہی طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ جو اگلے محدثین نے اختیار کئے ہیں۔ مگر ایک اور طریقہ بھی ان سب سے اسلم ہے جس کا نام درایت ہے۔ یعنی نفس حدیث پر غور کرنا اور سمجھنا کہ وہ شان نبوت کے مناسب ہے اور فی نفسہ صحیح بھی ہو سکتی ہے یا نہیں جامعین حدیث نے راویوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے پر زیادہ تر خیال کیا ہے۔ اور درایت پر بہت کم خیال کیا ہے۔ بلکہ نہیں کیا۔ پس اگر ہم درایت کو چھوڑ دیں۔ مثلاً بخاری و مسلم کی حدیثوں کو اس خیال سے کہ اس کے جمع کرنے والے نہایت بزرگ اور عالی درجہ تھے تسلیم کر لیں۔ اور بلا درایت کے مان لیں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم بجائے ابو حنیفہؒ اور مالکؒ اور شافعیؒ اور حنبل رحمہم اللہ کے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی تقلید کرتے ہیں پس ہم کو ان آئمہ کی تقلید میں کیا برائی تھی کہ ان کو چھوڑ کر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی تقلید کرنے لگے۔ میں حدیث کا خصوصاً بخاری اور مسلم کی حدیثوں کا نہایت ادب کرتا ہوں مگر ان پر درایت

سے کام لینے کو ضروری خیال کرتا ہوں۔

جو لوگ ایک ادنٰے حدیث کی بھی تحقیر کرتے ہیں۔ میں ان کو نہایت نالائق سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ حدیث رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ہو۔ حدیث کی تحقیر کرنا دوسری چیز ہے۔ اور کسی حدیث کی نسبت یہ بات کہنا۔ کہ ہمارے نزدیک ثابت نہیں دوسری چیز ہے۔ اور لوگوں کو اختیار ہے کہ ہماری بات کو مانیں یا نہ مانیں۔ علمائے حدیث نے بھی حدیث کی تنقیح کے لئے بہت سے اصول درایت کے قائم کئے ہیں۔ مگر ان کو صحاح ستہ کی حدیثوں پر کام میں نہیں لاتے۔ ان کے سوا اور حدیثوں پر کام میں لاتے ہیں۔ مگر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ انہیں اصولوں کو صحاح ستہ کی حد -ثوں پر کیوں کام میں نہیں لاتے۔ آپ کا یہ تحریر فرمانا کہ میں بڑے بھاری رکن اسلام یعنی حدیث کو اکھاڑنا چاہتا ہوں۔ معاف کیجئے۔ یہ آپ کی غلطی ہے۔ مگر احادیث کو مثل قرآن مجید کے بلاشبہ نہیں سمجھتا۔ محدثین رحمہم اللہ نے حدیث کے جمع کرنے میں جو کچھ محنت کی ہے تمام مسلمانوں کو ان کا شکر گذار ہونا واجب ہے۔ انہیں کی بدولت ہم اقوال و افعال رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے واقف ہوئے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہم اس بات کی بھی تنقیح کریں کہ در حقیقت وہ قول یا فعل رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے یا نہیں۔ اگر ہم کو یقین ہو کہ در حقیقت وہ قول و فعل رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ تو بغیر چون و چرا کے اس کے آگے سر جھکا دیں۔

جس شخص میں محبت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جاگزین ہوگی۔ نہ زید و بکر کی وہ تو اس بات سے انکار نہیں کر سکنے کا جو میں نے بیان کی۔

غرضیکہ جو مسئلہ آپ نے پوچھا ہے وہ بہت عمیق اور غور طلب ہے۔ اور بہت زیادہ وسیع تقریر اس کے لئے چاہئے۔ ایسے مختصر خطوں میں اس کے لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

والسلام۔

قبول عجائبات

دنیا میں قدرتی عجائبات اس قدر ہیں۔ کہ انسان نہ ان کو سمجھ سکتا ہے نہ گن سکتا ہے۔ دن کا ہونا۔ رات کا آنا۔ چمکدار سورج کا نکلنا باریک چاند کا دکھائی دینا۔ اور پھر بڑھتا جانا۔ بدر ہونا۔ اور اپنی چاندنی سے اندھیری دنیا کو روشن کرنا۔ پھر گھٹتا جانا۔ اور پہلی طرح باریک سا ہو کر چھپ جانا۔ کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے۔ کالی گھٹا کا اٹھنا۔ بڑے بڑے پہاڑوں سے بھی بڑے دَل بادلوں کا جمع ہو جانا۔ ہوا کے جھونکے سے ادھر ادھر دوڑتے پھرنا۔ بجلی کا چمکنا دل کو ہلانا۔ مینہ کے توقع سے دل خوش کرنا۔ پھر مینہ کا برسنا۔ اولوں کا پڑنا۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟

درختوں کا اگنا۔ ان کے ہرے ہرے پتوں کا نکلنا۔ طرح بطرح۔ رنگ برنگ کے پھولوں کا پھولنا۔ درختوں کی شاخوں میں طرح بطرح کے میوؤں کا لگنا۔ ان کے مزوں کا مختلف ہونا۔ کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے۔

پرندوں کا ہوا میں اڑنا۔ آسمان و زمین میں معلق رہنا۔ بۓ کا عجیب طرح پر گھونسلا بنانا۔ شہد کی مکھی کے کرتب۔ اس کا نہایت اعلیٰ اصول۔ اقلیدس پر چھتا بنانا۔ پہاڑوں پر اور اونچی اونچی جگھوں میں لگانا۔ ہر ایک قسم کے مفید پھولوں سے رس چوس کر لانا۔ اور مختلف رنگوں کا شہد بنانا۔ کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟

گائے۔ بھینس۔ اور لال گائے۔ بکری سے جن کے پیٹ میں جنگل کا چارا سڑ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ سفید اور شیریں مزے دار دودھ کا نکلنا۔ اس سے ان کے بچوں کی پرورش ہونا۔ اور انسان اور اس کے بچوں کے لئے نہایت عمدہ اور مفید غذا کا ہونا۔ کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟

خود۔ انسان کا بلکہ تمام حیوانات کا۔ اور انڈے سے مرغی کا۔ اور مرغی سے انڈے کا پیدا ہونا۔ پھر ان کا دلکش آوازوں سے بولنا۔ چہچہانا۔ انسان کا اپنے قواء عقلی۔ اور دماغی سے ایسے اعلیٰ درجہ تک پہنچنا۔ جہاں بقول شخصے جبرئیل کے بھی پر جلتے ہیں۔ کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟

مگر چونکہ یہ باتیں روزمرہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان کا عجیب بلکہ عجیب تر ہونا۔ انسان کے خیال میں نہیں رہتا۔ اور اس سے ذہول ہو جاتا ہے۔ مگر انسان جب کسی مذہب پر اعتقاد لاتا

ہے۔ یا کسی شخص کو مقدس سمجھتا ہے تو عجائبات کو اس کے ساتھ لگاتا ہے۔ اور جو عجائبات اس کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔ ان سب کو قبول کرتا ہے۔ بلکہ بغیر ان عجائبات کے مذہب کی حقیت یا اس شخص کے تقدس کو تسلیم نہیں کرتا۔

حضرت نوح علیہ السلام کو کتنا ہی مقدس اور خدا کا پیغمبر کہا جاوے۔ مگر جب تک طوفان نوح کو ایسا نہ مانا جاوے کہ ایک بڑھیا کے تنور میں سے پانی ابلتا۔ اور مینہ ایسے زور شور سے چالیس دن رات برستا رہا۔ جس کے سبب تمام دنیا ڈوب گئی۔ بلند سے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے بھی پانی اونچا ہو گیا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام نے خدا کے حکم سے کشتی بنائی۔ اور کشتی کے تختے فرشتے بہشت سے لائے۔ پھر ان کی دعا سے طوفان موقوف ہوا اور تمام دنیا کے انسان اور جانور سوائے ان کے جو کشتی میں تھے۔ سب ڈوب کر مر گئے۔ اس وقت تک حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت اور ان کا تقدس قبول ہی نہیں ہو سکتا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسبت اگر یہ یقین نہ کیا جاوے کہ وہ تمام جانوروں کی زبانیں سمجھتے تھے۔ اور ہوا ان کے تخت کو اڑائے پھرتی تھی اور جن اور پری ان کی تابع تھے۔ اس وقت ان کا مقدس ہونا اور نبی ہونا تسلیم نہیں کیا جاتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت جب تک یہ یقین نہ کیا جاوے۔ کہ خدا ان سے باتیں کرتا تھا۔ اور اس نے اپنی انگلی سے پتھر کی تختیوں پر توریت لکھی تھی۔ اور وہ لکڑی کو سانپ بنا دیتے تھے۔ اور سمندر کو چیر کر چلے گئے تھے اس وقت تک ان کا نبی ہونا نہیں مانا جاتا۔

حضرت یوشع کے حکم سے اگر آفتاب کا ٹھہر جانا۔ نہ مانا جاوے۔ تو گویا ان کی نبوت ہی کو نہیں مانا۔

اگر یہ نہ مانا جاوے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی نگل گئی تھی اور تین دن تک وہ اس کے پیٹ میں رہے۔ اور پھر اس نے ان کو کنارے پر اگل دیا۔ اور پھر وہ جیتے جاگتے نکل آئے۔ اس وقت تک گویا ان کے تقدس اور نبوت کا یقین ہی نہیں ہوتا۔

جب تک یہ نہ مانا جاوے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ اور مردوں کو جلاتے تھے۔ اور کوڑھیوں اور اندھوں کو اچھا کرتے تھے۔ پھر مع اپنے جسم کے آسمان پر چلے گئے۔ اور چوتھے آسمان پر بیٹھے ہیں۔ اس وقت تک گویا۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام کے نبی ہونے کا یقین ہی نہیں کیا جاتا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم باوجودیکہ فرماتے رہے۔ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوحیٰ اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ واحِدٌ۔ مگر لوگوں نے اس پر قناعت نہ کی۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی بہت سے عجائبات منسوب کردئے اور انہیں عجائبات پر یقین رکھنا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرنا قرار پایا ہے۔

یہی خیال اولیاء اللہ تک بھی پہنچ گیا۔ جب تک کہ ان میں کرامتیں نہ مانی جائیں۔ اور ان پر یقین نہ کیا جاوے۔ کہ ولیوں نے مردوں کو بھی زندہ کردیا ہے۔ اور برسوں کی ڈوبی ہوئی برات کو دریا میں سے زندہ نکال دیا۔ اور چنیں اور چنان کیا۔ اس وقت تک ان کے ولی ہونے پر بھی یقین نہیں ہوتا۔

غرض کہ انسان کی یہ جبلت ہے کہ جس چیز کو بزرگ سمجھتا ہے۔ اور جن اشخاص کو مقدس جانتا ہے۔ ان کی نسبت ایسے عجائبات منسوب کردیتا ہے۔ یہی باعث ہے۔ کہ مذہب اسلام میں بھی لوگوں نے بہت سے عجائبات شامل کردئے ہیں۔ جو قابل یقین نہیں ہیں۔ مگر وہ لوگ ان کو قبول کرتے ہیں۔

رفتہ رفتہ لوگوں کے خیال میں یہ بات جم گئی ہے کہ عجائبات کے بغیر نہ مذہب چلتا ہے نہ لوگ ایسے مذہب کو جس میں کچھ عجائبات نہ ہوں۔ قبول کرتے ہیں۔

مگر یہ سخت غلطی ہے۔ کوئی مذہب جو سچا ہے۔ اور سچا ہونے کا دعوے کرتا ہے۔ اس میں کبھی ایسے عجائبات نہیں ہوتے۔ جو فطرت کے خلاف ہوں عقل انسانی کے خلاف ہوں۔ اور کوئی سمجھ دار آدمی ان کو تسلیم نہ کرے۔ بلکہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات خلاف فطرت اور خلاف عقل سے بالکل پاک اور خالی ہوتا ہے۔ گو کہ بعد کو اس کے ماننے والوں نے عجائبات پرستی کی راہ سے اس میں بہت سے عجائبات شامل کردئے ہیں۔

مذہب اسلام کی نسبت ہم دل سے یقین کرتے ہیں کہ وہ ایسی عجیب کہانیوں اور ایسی حیرت انگیز خلاف فطرہ اور خلاف عقل باتوں سے پاک ہے اور اس میں جس قدر حصہ عجائبات کا ہے وہ ان عجائب پرستوں کا شامل کیا ہوا ہے جو قدرت کے عجائبات کو ذہول کرتے ہیں اور خلاف قدرت اور خلاف عقل عجائبات کو قبول کرتے ہیں۔ خدا ان عجائب پرستوں سے بچائے۔

قرآن مجید کی قسمیں

لوگ تعجب کرتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اتنی قسمیں کیوں کھائیں۔ مگر اس شبہ کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہے۔ کہ انہوں نے قرآنِ مجید کے طرز کلام پر غور نہیں کیا۔

اوّل یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ قرآن مجید بلاشبہ خدا کا کلام ہے مگر وہ انسانوں کی زبان اور محاورہ میں نازل ہوا ہے اور اس کا طرز کلام بعینہٖ ایسا ہے جیسے کہ ایک نہایت فصیح شخص عربی زبان میں کلام کرتا ہو اور اس کی فصاحت بے مثل ہو۔

جس طرح کہ انسان کی زبانوں میں استعارہ اور کنایہ اور مجاز اور حقیقت پایا جاتا ہے اسی طرح کلام اللہ میں بھی موجود ہے۔ یہاں تک کہ عربی زبان میں غیر قوموں کے جو الفاظ شامل ہو گئے تھے وہ بھی قرآن مجید میں ہیں۔ زمانہ نبوت میں جو طرز کلام عرب میں تھا اور جس طرح کہ وہ بات چیت کرتے تھے یا اپنے کلام کے استحکام اور اسکی سچ ہونے پر زور دیتے تھے۔ اور جس قدر الفاظ غیر قوموں کے ان کی زبان میں مل گئے تھے۔ اسی طرز کلام پر قرآن مجید نازل ہوا ہے۔

مثلاً لفظ سرادق جو قرآن میں ہے عربی کا لفظ نہیں ہے بلکہ لفظ سراپردہ جو فارسی زبان کا ہے اس کو معرب کر کے سرادق کرلیا ہے۔

ابریق کا لفظ بھی قرآن مجید میں موجود ہے حالانکہ وہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے بلکہ فارسی لفظ آبریز کو معرب کر کے ابریق بنالیا ہے۔

استبرق کا لفظ بھی قرآن مجید میں ہے وہ بھی عربی زبان کا لفظ نہیں ہے بلکہ فارسی زبان کے لفظ استروہ سے معرب کیا گیا ہے۔

کنز کا لفظ بھی قرآن مجید میں ہے اور وہ بھی عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ بلکہ فارسی لفظ گنج سے معرب ہوا ہے۔

فردوس کا لفظ بھی قرآن مجید میں موجود ہے جو عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ بلکہ آرین خاندان کی زبانوں سے لیا گیا ہے اور جو سنسکرت میں پردیش ہے۔ جس کے معنی اجنبی ملک کے ہیں۔ یہی لفظ جس کی شکل انگریزی زبان میں پیراڈایز ہو گئی ہے۔

اسی طرح بہت سے لفظ قرآن مجید میں ہیں جو عربی زبان کے لفظ نہیں ہیں۔ بلکہ عبرانی، سریانی، قبطی، فارسی، لاطینی اور یونانی زبانوں سے معرب ہو کر عربی زبان میں شامل ہو گئے ہیں۔ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "اتقان فی علوم القرآن" میں ایک مستقل باب ان الفاظ کے لئے باندھا ہے جو غیر زبانوں سے معرب ہو کر عربی زبان میں شامل ہو گئے ہیں اور قرآن مجید میں موجود ہیں۔

غرضیکہ قرآن مجید ایسی زبان میں نازل ہوا ہے۔ جو اس زمانہ کے اہل عرب کی زبان تھی۔

طرز کلام قرآن مجید کا بھی اسی زمانہ کے طرز کلام پر ہے۔ اس زمانہ میں کاہنوں کی جو عرب میں مقدس گنے جاتے تھے یہ عادت تھی کہ عموماً فصیح کلام کرتے تھے اور اکثر مقفّٰی کلام بولتے تھے اور قسموں کا استعمال بھی کرتے تھے۔ اور جس بات کو وہ بطور کہانت یعنی اخبار بالغیب کے سچ سمجھتے تھے اور دوسروں کو اس کے سچ ہونے کا یقین دلانا چاہتے تھے اس کو قسموں کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ اسی طرز کلام پر جو عربوں کو عام طور پر مرغوب اور دل پسند تھا۔ اور جو نہایت فصیح طرز کلام سمجھا جاتا تھا۔ قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ اور اس میں بھی جن باتوں کا یقین دلانا منظور ہے ان کو قسموں کے ساتھ بیان کیا ہے اور اسی طرز کلام کے سبب سے عرب کے لوگ آنحضرت کو کاہن خیال کرتے تھے۔ جس کی قرآن مجید میں تردید کی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں خدا فرماتا ہے۔ فلا اقسم بما تبصرون وما لا تبصرون انہ لقول رسول کریم وما ھو بقول شاعر قلیلا ما تومنون ولا بقول کاھن قلیلا ما تذکرون تنزیل من رب العالمین۔ "یعنی جو چیز تم کو دکھائی دیتی ہے اور جو نہیں دکھائی دیتی ہم کو اس کی قسم ہے کہ یہ قرآن مجید ایک بڑے پیغمبر کا کلام ہے اور کسی شاعر کا کلام نہیں ہے مگر تم بہت کم یقین کرتے ہو۔ اور نہ وہ کسی کاہن کا قول ہے۔ مگر تم بہت کم غور کرتے ہو۔ یہ پروردگار عالم کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ (الحاقہ۔ ۳۸۔ ۴۳)

اس تردید کو بھی خدا نے قسم ہی کے ساتھ بیان کیا ہے اور قسم بھی ایسی جو انہی کی سمجھ کے موافق تھی۔ دوسری جگہ خدا نے خود پیغمبر سے خطاب کر کے فرمایا ہے۔ "فذکر فما انت بنعمت ربک بکاھن ولا مجنون۔" یعنی اے پیغمبر تو نصیحت کئے جا خدا کے فضل سے نہ تو کاہن ہے نہ مجنون ہے۔ (طور۔ ۲۹)

زمانہ جاہلیت کا کلام ہم تک بہت کم پہنچا ہے۔ مگر ابن اثیر نے اپنی کتاب کامل میں قبیلہ بنی خزاء کے ایک کاہن کا قول ہاشم کی فضیلت اور امیہ کے منقصت میں نقل کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کس قدر قسمیں کھائیں ہیں اور وہ قول یہ ہے۔ "والقمر الباھر والکوکب الزاھر والغمام الماطر وما بالجو من طائر وما اھتدی بعلم مسافر من منجد وغائر لقد سبق ھاشم امیہ فی الماثر اول منہ واخر وبو ھمہ بذلک خابر۔" یعنی قسم ہے روشن چاند کی۔ قسم ہے روشن ستاروں کی۔ قسم ہے برستے بادلوں کی۔ قسم ہے آسمان میں اڑنے والے پرندوں کی۔ قسم ہے اونچے اونچے راستوں میں چلنے والے مسافروں کے نشانوں سے ہدایت پانے کی کہ ہاشم امیہ پر اگلی اور پچھلی نیکیوں میں سبقت لے گیا ہے۔ اور ابو ہمہ کو اس بات کی خبر ہے (کامل ابن اثیر مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۸)

اسی طرح قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ "وَالشَّمْسِ وَضُحٰھَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰھَا وَالنَّھَارِ اِذَا جَلّٰھَا وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰھَا وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰھَا وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰھَا۔" یعنی قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔ قسم ہے چاند کی جب وہ سورج کے پیچھے نکلتا ہے۔ قسم ہے دن کی جب کہ سورج اس کو روشن کرتا ہے۔ قسم ہے رات کی جب کہ وہ سورج کو چھپا لیتی ہے۔ قسم ہے آسمان کی اور اس کے بنانے والے کی قسم ہے زمین کی اور اس کے بنانے والے کی۔

پس یہ قسمیں اسی طرز کلام پر واقع ہوئی ہیں۔ جو عرب کا طرز کلام تھا۔ ہاں اس طرح قسمیں کھانے پر اس بات کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہر گاہ خدا کے سوا اور کسی کی قسم کھانی منع کی گئی ہے تو خود خدا نے غیر خدا کی قسمیں کیوں کھائی ہیں مگر غیر خدا کی قسمیں کھانے کا امتناع اس سبب سے ہے کہ غیر خدا کی قسمیں کھانے سے اس میں شان الوہیت کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ مگر جب کہ تسلیم کر لیا جاوے جیسا کہ قرآن مجید میں جابجا بتایا گیا ہے کہ تمام چیزیں مخلوق ہیں اور خدا ان سب کا خالق ہے۔ تو اگر خدا اپنی مخلوق کی قسم کھاوے تو کسی طرح شائبہ الوہیت اس مخلوق میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور اگر کچھ سمجھا جاتا ہے تو اسی قدر سمجھا جاتا ہے کہ وہ چیزیں اپنی خلقت میں یا انسان کے لئے مفید ہونے میں عظیم الشان اور عظیم القدر ہیں۔ لیکن اگر انسان ان میں سے کسی کی قسم کھاوے خصوصاً ایسی چیزوں کی جن کو مشرکین پوجتے تھے۔ تو ان میں شائبہ الوہیت کے ماننے کا شبہ جاتا ہے اور اس لئے انسانوں کو غیر خدا کی قسم کھانا منع کیا گیا ہے۔

عرب کے لوگوں میں جو یہ عادت تھی کہ باتوں میں بہت سی قسمیں کھایا کرتے تھے۔ اور بعضے ایسے تھے کہ قسم کھانا ان کا تکیہ کلام ہو گیا تھا اور ہر بات پر "لا واللہ۔ بلی واللہ" بطور تائید کے و توثیق اپنی کلام کے کہا کرتے تھے اور ان کو ہر گز یہ خیال نہیں ہوتا تھا۔ کہ ہم نے کوئی قسم کھائی ہے۔ اسی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے "لا یوٴاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یواخذکم ماکسبت قلوبکم" یعنی تمہاری قسموں میں جو لغو قسمیں ہیں ان پر خدا تم سے مواخذہ نہیں کرنے کا۔ لیکن جو قسمیں تم نے دل کے ارادے سے کھائی ہیں ان پر مواخذہ کریگا۔

دوسری آیت میں "بماکسبت قلوبکم کی جگہ "بماعقدتم الایمان" ہے۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ کہ خدا انہیں قسموں پر پکڑے گا جن کو تم نے سمجھ بوجھ کر پختہ کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کا مذہب حنیف

مامون رشید کے زمانہ میں عبدالمسیح ابن اسحٰق کندی جس کا عیسائی مذہب تھا۔ اور بہت بڑا عالم تھا۔ مامون رشید کے دربار میں ایک بہت معزز عہدہ پر ملازم تھا۔ مامون رشید کے ایک قریبی رشتہ دار نے جس نے اپنا لقب الہاشمی قرار دیا ہے ایک خط عبدالمسیح کے نام دعوت اسلام کا بھیجا اور یہ خواہش کی کہ وہ بھی مسلمان ہو جائے عبدالمسیح نے نہایت سختی سے اس خط کا جواب لکھا ہے اور اسلام قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس جواب میں یہ بات بھی لکھی ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ اس زمانہ تک جب کہ وہ پیغمبر ہوئے یعنی پچھتر برس کی عمر تک بت پرستی کیا کرتے تھے اور وہی بت پرستی کا مذہب مذہب حنیف کہلاتا تھا۔ مگر یہ دونو باتیں محض غلط ہیں۔ توریت مقدس سے یا اور کسی کتاب سے ثابت نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کسی وقت اور کسی زمانہ میں بت پرستی کی ہو۔ بلکہ برخلاف اس کے قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت متعدد جگہ آیا ہے کہ "ماکان من المشرکین" یعنی ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اور خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول قرآن مجید میں مذکور ہے۔ کہ حضرت ابراہیم نے کہا۔ ماانا من المشرکین" یعنی میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ پس بِلا سند اور بلا دلیل یہ کہنا۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پچھتر برس کی عمر تک بت پرستی کرتے تھے محض بے اصل اور صرف اتہام ہے۔ پچھتر برس کی عمر ہم نے توریت کے حساب سے لکھی ہے۔ مگر جو عمریں توریت میں لکھی ہوئی ہیں ان کی صحت نہایت مشتبہ اور بحث طلب ہے۔

تمام انبیاء اسی قوم میں سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی قوم میں پلتے اور بڑھتے ہیں۔ جس کی بری باتوں کی اصلاح کے لئے وہ مبعوث ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ امر طبعی ہوتا ہے کہ جن بری باتوں کی اصلاح وہ اپنے زمانہ رشد میں کرتے ہیں ابتدا ہی سے ان کو ان سے نفرت ہوتی ہے اور اس لئے کبھی وہ ان امور میں ملوث نہیں ہوتے۔ اگر وہ ان میں ملوث ہوں تو زمانہ رشد میں ان امور کی اصلاح ان سے ہونی نہایت مشکل ہے۔ کیونکہ جو مقتضائے طبیعت ہوتا ہے وہی زمانہ رشد میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس گو حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ جو بت پرستی میں ملوث تھا۔ مگر صرف ایسے خاندان میں پیدا ہونے سے یہ خیال

نہیں ہو سکتا۔ کہ انہوں نے بھی بت پرستی کی ہو اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت بت پرستی کا خیال سراسر غلط اور محض بیہودہ ہے۔

اور یہ بات بھی کہ وہی بت پرستی کا مذہب مذہب حنیف کہلاتا تھا محض غلط ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مذہب توحید ذات باری کا تھا اور ان کے مراسم مذہبی جیسے کہ حج خانہ کعبہ کا ہے تمام ملک عرب میں پھیل گئے تھے اور حضرت ابراہیم کا مذہب توحید مذہب حنیف کہلاتا تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے بت پرستی کو اس مذہب میں ملا دیا تھا۔ مگر وہ ابراہیمی مذہب کے مراسم بھی مثل حج کعبہ وغیرہ ادا کرتے تھے۔ اور اس لئے اپنے مذہب کا وہی پرانا نام لیتے تھے اور مذہب حنیف کہتے تھے۔ مگر بت پرستی مذہب عنیف ابراہیمی میں نہ تھی۔ چنانچہ تاج العروس شرح قاموس میں لکھا ہے۔

وکان عبدۃ الاوثان فی الجاھلیۃ یقولون نحن حنفاء علی دین ابراھیم فلما جاء الاسلام سموا المسلم حنیفا و قال الاخفش وکان فی الجاھلیۃ یقال من اختتن وحج البیت قیل لہ حنیفا لان العرب لم تمسک فی الجاھلیۃ بشئ من دین ابراھیم غیر الختان و حج البیت وقال الزجاجی الحنیف فی الجاھلیۃ من کان یحج البیت و یغتسل من الجنابۃ ویختتن فلما جاء الاسلام کان الحنیف المسلم لعدولہ عن الشرک۔

یعنی بت پرست لوگ ایام جاہلیت میں دعوئ کرتے تھے کہ ہم حنیف ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کے مذہب پر ہیں۔ جب مذہب اسلام کا ظہور ہوا۔ تو مسلمان بھی حنیف کہنے لگے۔ اخفش نے کہا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ ختنہ کرتے تھے اور کعبہ کا حج کرتے تھے ان کو حنیف کہتے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں عرب کے لوگوں نے سوائے ختنہ اور حج کعبہ کے ابراہیمی مذہب میں سے کوئی چیز اختیار نہیں کی تھی۔ زجاجی کہتا ہے کہ عرب جاہلیت ان لوگوں کو جو کعبہ کا حج کرتے تھے۔ اور جنابت کے بعد غسل کرتے تھے اور ان میں ختنہ کی رسم بھی جاری تھی حنیف کہتے تھے۔ جب اسلام شروع ہوا تو مسلمانوں کو بھی حنیف اس لئے کہنے لگے کہ وہ شرک سے باز رہے تھے۔

پس یہ کہنا کہ جو مذہب بت پرستی کا تھا وہی مذہب حنیف کہلاتا تھا۔ صریح غلطی ہے۔ خدا نے اس التباس کو جابجا قرآن مجید میں رفع کیا ہے۔ کیونکہ جہاں قرآن مجید میں مذہب

حنیف کا ذکر آیا ہے۔ اس کے ساتھ اس مذہب کے شرک سے بری ہونے کا بھی ذکر آیا ہے۔ جس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ حنیف سے وہ مذہب مراد نہیں ہے۔ جس میں شرک اور بت پرستی داخل ہو گئی تھی۔ اور جس کو مشرکان زمانہ جاہلیت مذہب حنیف کہتے تھے۔ بلکہ خاص مذہب توحید ذات باری جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مذہب تھا لفظ حنیف سے وہی مذہب مراد ہے نہ وہ مذہب جس کو مشرکین عرب مذہب حنیف کہتے تھے۔

سورۃ بقر میں خدا نے فرمایا ہے۔ "وقالوا کونوا ھودا او نصاری تھتدوا قل بل ملتہ ابراھیم حنیفا وماکان من المشرکین" (آیت ۱۲۹) یعنی اور کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہود یا نصاریٰ تو راہ پر آؤ گے۔ اے پیغمبر کہدے کہ نہیں ہم نے ابراہیم کا مذہب اختیار کیا ہے جو ایک خدا کا ہو رہا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

سورۃ آل عمران میں خدا نے فرمایا ہے "ماکان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مسلما وماکان من المشرکین" (آیت ۶۰) یعنی ابراہیم نہ یہودی تھا نہ نصرانی بلکہ ایک خدا کا ماننے والا مسلمان تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

سورۃ آل عمران میں دوسری جگہ خدا نے فرمایا ہے۔ "قل صدق اللہ فاتبعوا ملتہ ابراھیم حنیفا وماکان من المشرکین" (آیت ۸۹) یعنی اے پیغمبر کہدے خدا نے سچ فرمایا ہے کہ تم ابراہیم کے مذہب کی پیروی کرو۔ جو ایک خدا کا ماننے والا تھا۔ اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

سورۃ انعام میں خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول فرمایا ہے۔ "انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین" (آیت ۷۶) یعنی میں نے اپنا منہ اس کی طرف پھیرا ہے۔ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اسی کا ماننے والا ہو کر اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اور سورۃ انعام میں دوسری جگہ خدا نے فرمایا ہے۔ "قل اننی ھدانی ربی الی صراط مستقیم دینا قیما ملتہ ابراھیم وماکان من المشرکین" (آیت ۱۶۲) یعنی اے پیغمبر کہدے کہ مجھ کو میرے پروردگار نے سیدھے رستہ کی ہدایت کی ہے۔ یعنی صحیح مذہب کی جو ابراہیم کا مذہب تھا۔ اور جو ایک خدا کا ماننے والا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

سورۃ یونس میں خدا نے فرمایا ہے۔ " وان اقم وجھک للدین حنیفا ولا تکونن من المشرکین " (آیت ۱۰۵) یعنی مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنا منہ مذہب کی طرف سیدھا رکھ ایک خدا کا ماننے والا ہو کر اور شرک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

سورۃ نحل میں خدا نے فرمایا ہے " ان ابراھیم کان امتہ قانتا للہ حنیفا ولم یک من المشرکین (آیت ۱۲۱) یعنی ابراہیم ایک بزرگ تھا خدا کی عبادت کرنے والا اور ایک خدا کے ماننے والا اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

سورۃ نحل میں دوسری جگہ خدا نے فرمایا ہے۔ " ثم او حینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا وماکان من المشرکین " (آیت ۱۲۴) یعنی پھر ہم نے تیرے پاس وحی بھیجی کہ مذہب ابراہیم کی پیروی کر جو ایک خدا کا ماننے والا تھا۔ اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

سورۃ حج میں خدا نے فرمایا ہے۔ " فاجتنبوا الرجس من الاوثان وا جتنبوا قول الزور حنفا اللہ غیر مشرکین " (آیت ۳۱، ۳۲) یعنی تم بتوں کی ناپاکی سے بچتے رہو۔ اور جھوٹی باتوں سے بچتے رہو ایک خدا کے ماننے والے اور اس کے ساتھ شرک نہ کرنے والے ہو کر۔

سورۃ بینہ میں خدا نے فرمایا ہے " وما امروا الا یعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء و یقیموا الصلوۃ ویوتوا الزکوۃ وذلک دین القیمہ " (آیت ۴) یعنی ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ خدا کی عبادت کریں خالص اس کے لئے اور بندگی کریں اس کی مخلص ہو کر۔ نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں اور یہی مذہب ٹھیک ہے۔

پس بت پرستی کے مذہب کو مذہب حنیف قرار دینا نہایت بڑی غلطی ہے۔

صبانا صبانا

یہ کس نے کہا؟ بنی خزیمہ نے۔ مگر افسوس ہے کہ حضرت خالد ابن ولید اس کا مطلب نہیں سمجھے اور ان کو قتل کر دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے خالد ابن ولید کو بنی خزیمہ کے پاس بھیجا۔ کہ ان کو اسلام کی طرف دعوت دیں۔ بنی خزیمہ نے بجائے اس کے کہ۔ 'اَسلمنا' کہیں 'صبانا' صبانا کہا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنے مذہب سے پھر گئے یعنی مسلمان ہو گئے۔ حضرت خالد اس مطلب کو نہیں سمجھے اور ان کو قتل کر دیا۔ جب رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی تو آپ نے فرمایا کہ اے خدا میں بری ہوں اس کام سے جس کو خالد نے کیا۔

غور طلب یہ بات ہے کہ جو لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب میں آتے ہیں ان کے دل میں کیا بات پیدا ہوتی ہے۔ جس کے سبب سے وہ دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں۔

جو لوگ کسی خوف سے یا کسی لالچ سے اپنا پہلا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں وہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔ ہم اس بات پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ کہ دوسرے مذہب کی کیا خوبی نہایت سچائی سے ان کے دل میں بیٹھتی ہے۔ جس سے وہ پہلا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں۔

اگر کسی شخص نے اپنے مذہب میں جس میں کہ وہ ہے سخت پابندیاں اور سخت احکام دیکھے۔ جس سے اس کو اپنی زندگی تلخ معلوم ہوئی اور دوسرے مذہب میں اس نے آسانی اور ان سخت پابندیوں سے نجات دیکھی اور اس لئے اس مذہب کو اختیار کر لیا۔ تو اس کو بھی ہم انہیں شخصوں میں شمار کرینگے جنہوں نے کسی لالچ سے دوسرا مذہب اختیار کیا ہے۔ حالانکہ ہم اس سچائی کی تلاش کے درپے ہیں جو دوسرے مذہب کی اس کے دل میں بیٹھی اور اس کے سبب سے اس نے دوسرا مذہب اختیار کیا۔

اس بات کا ہم کو یقین نہیں ہوتا۔ کہ جو دوسرا مذہب اس نے اختیار کیا ہے اس کے تمام مسائل اور عقاید پر اس نے بخوبی غور کر کے اور ہر ایک مسئلہ اور عقیدہ کو دوسرے مذہب کے عقاید اور مسائل پر ترجیح دیکر دوسرا مذہب اختیار کیا ہو۔ کیونکہ یہ امر تو نہایت

مشکل کام ہے۔ ایک بہت بڑا عالم بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ پس کیا چیز ہے جو مذہب کو بدلوا دیتی ہے۔

صحبت بھی دوسرے مذہب کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ مگر ہم اس کو بھی اس میں شمار نہیں کرتے۔ جس میں کسی شخص نے نہایت سچائی اور ایمانداری سے دوسرے مذہب کو سچ اور برحق سمجھ کر اختیار کیا ہو۔ اور اپنا مذہب چھوڑ دیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ سیدھی راہ اختیار کرنی خدا کی ہدایت پر موقوف ہے ہم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سیدھی راہ یعنی مذہب حق اختیار کرنا بلاشبہ خدا کی ہدایت پر موقوف ہے۔ مگر ان کی نسبت ہم کیا کہیں کہ جو مذہب حق کو چھوڑ کر دوسرا مذہب جو گمراہی ہے اختیار کرتے ہیں۔ ہدایت اور گمراہی دونوں خدا کے اختیار میں ہیں۔ مگر ہم اس بات کی تلاش میں ہیں کہ کیا چیز انسان کے دل میں آجاتی ہے۔ جس کے سبب وہ مذہب تبدیل کر ڈالتا ہے خواہ وہ مذہب جو اس نے پہلا مذہب تبدیل کر کے اختیار کیا ہے حق ہو یا باطل ہو۔

موجودہ اور گذشتہ زمانہ کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ ان اسباب کے جو ہم نے اوپر بیان کئے یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کے دل کو کسی مذہب کی کچھ باتیں کسی دلیل سے یا بغیر کسی دلیل کے سچ اور صحیح معلوم ہونے لگتی ہیں اور وہ ان کو نہایت نیک نیتی سے اور سچے دل سے سچا اور برحق سمجھتا ہے اور اس لئے اس مذہب کو اختیار کر لیتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اس مذہب کی تمام باتیں اس کو سچی معلوم ہونے لگتی ہیں اور وہ اس مذہب کو پورا پورا اختیار کر لیتا ہے۔

اس بات کا سبب کہ اس شخص کو کسی مذہب کی کچھ باتیں کیوں سچ معلوم ہونے لگی ہیں زیادہ تر ان لوگوں کی بزرگی اور تقدس اور اخلاق کی خوبی، نیکی اور نیک خصلت پر منحصر ہوتا ہے جو اس مذہب کا وعظ کرتے ہیں یا اس مذہب کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ خود بھی وہی کرتے ہیں جو کہتے ہیں۔ ان کا قول اور فعل، ظاہر و باطن، سب یکساں ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام ان صفات کے جامع ہوتے ہیں۔ جو انسان میں حسب فطرت انسانی جمع ہو سکتی ہیں۔ ان کا وظیفہ شبانروزی انسان کو خدائے واحد کی پرستش اور نیکی اور نیک دلی کی ہدایت کرنا ہوتا ہے اور جو کہ ان کا طریقہ عمل بالکل اس کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کی وہ لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں اور وہی خود بھی کرتے ہیں جو لوگوں سے کرنے کو کہتے ہیں اس لئے

درحقیقت وہ معصوم ہوتے ہیں یعنی بری باتوں سے محفوظ اور اچھی باتوں میں مشغول رہتے ہیں۔ پس ہمارے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا ضروری ہے اور اگر معصوم نہ ہوں تو ان سے پوری پوری امت کی ہدایت غیر ممکن ہے۔

یہی طریقہ اب تک چلا آتا ہے علماء کو جنہوں نے اپنی اپنی تمام زندگی علوم کے حاصل کرنے میں صرف کردی ہے ان کو تو علیحدہ رکھو۔ مگر جن لوگوں نے روحانی نیکی حاصل کرنے پر توجہ کی ہے خواہ وہ عالم ہوں یا جاہل۔ ہاں اگر عالم میں بھی ہوں تو نور علے نور ہیں۔ ان کے اخلاق اور اوصاف انبیاء علیہم السلام کے اخلاق اور اوصاف کے زیادہ مشابہ ہو جاتے ہیں اور انہی سے صراط مستقیم یعنی مذہب اسلام کی اشاعت ہوتی ہے۔ یہی حال ہندوستان میں ہوا ہے۔ علماء کے ذریعہ سے تو شاید دو چار دس پانچ آدمی مسلمان ہوئے ہوں مگر فقرا اور اولیاء اللہ کی بدولت ہزاروں لاکھوں آدمی مسلمان ہوئے ہیں۔ پس مذہب کی خوبی انہیں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے جو نیکی کا پتلا ہو جاویں۔ ورنہ ایسے لوگ تو بہت مارے مارے پھرتے ہیں جن کی نسبت حافظ نے کہا ہے کہ ؎

واعظاں کیں جلوہ در محراب و منبری کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

اللھم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیرالمغضوب علیھم ولا الضالین۔ آمین

ناسخ و منسوخ

ہم کو ہمارے ایک دوست نے اطلاع دی ہے۔ کہ ہم نے اپنی تفسیر کی پہلی جلد میں جہاں ناسخ و منسوخ کی بحث کی ہے۔ امام فخرالدین رازی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ آیت مَا نَنسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا سے قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اور دو آیتیں ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے۔ پہلی آیت تو "یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت عندہ امّ الکتاب" ہے۔ دوسری آیت "اذا بدّلنا اٰیۃً مکان اٰیۃٍ" ہے۔ اور ہم نے لکھا تھا۔ کہ ان دونوں آیتوں سے بھی قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اور وعدہ کیا تھا۔ کہ ہم ان دونوں آیتوں کی تفسیر میں اس کو بیان کریں گے۔ مگر سورہ رعد اور سورہ نحل میں جہاں ان آیتوں پر بحث کرنے کا موقع تھا۔ ہم بحث کرنی بھول گئے اور اس لئے اب ان پر بحث کرتے ہیں۔

پہلی آیت سورہ رعد کی ہے۔ اس میں خدا فرماتا ہے۔ کہ

"ولقد ارسلنا رسلاً من قبلک و جعلنا لھم ازواجاً و ذریۃً وما کان لرسول ان یاتی باٰیۃ الا باذن اللہ لکل اجل کتاب یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت وعندہ ام الکتاب۔"

بے شک ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے ہیں۔ اور ان کو بیبیاں اور اولاد دی ہے۔ اور کوئی رسول نہیں کر سکتا۔ کہ بغیر حکم خدا کوئی حکم لے آئے اور ہر ایک چیز کا وقت لکھا ہوا یعنی مقرر ہے۔ خدا جو چاہے مٹائے اور جو چاہے قائم رکھے اور اس کے پاس اصل کتاب ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے۔ کہ جو کچھ اس آیت میں بیان ہوا ہے وہ انبیاء سابق کی شریعت سے متعلق ہے۔ نہ قرآن مجید کی آیتوں سے۔ نتیجہ اس تمام آیت کا یہ ہے کہ انبیاء سابق کی شریعت میں سے جن احکام کو خدا چاہتا ہے۔ قائم رکھتا ہے اور جن احکام کو چاہتا ہے اٹھا دیتا ہے۔ اور اس آیت سے کسی طرح سے یہ بات نہیں نکلتی کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت سے منسوخ ہو جاتی ہے۔ پس یہ آیت قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ ہونے پر کسی طرح دلالت نہیں کرتی۔ مگر یہ بحث باقی رہتی ہے۔ کہ ام الکتاب کیا چیز ہے۔ اور اگر ام الکتاب سے لوح محفوظ مراد لی جاوے تو لوح محفوظ کیا چیز ہے۔ یہ ایک بہت بڑی بحث ہے۔

جس کو ہم اپنی تصنیفات میں متعدد جگہ لکھ چکے ہیں۔ مگر اس مقام میں اس کی بحث سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ صرف یہ بات ثابت کرنی تھی۔ کہ "یمحو اللہ مایشاء و یثبت" سے مقصود محو ہونا یا ثابت رہنا احکام شریعت انبیاء سابق کا ہے۔ نہ محو ہونا یا ثابت رہنا قرآن مجید کی آیتوں کا۔ اس لئے ہم اسی قدر بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

دوسری آیت سورہ نحل کی ہے جس میں خدا فرماتا ہے۔

"واذا بدّلنا اٰیۃ مکان ایۃ واللہ اعلم بما ینزّل قالوا انما انت مفتر بل اکثرھم لا یعلمون۔

کہ جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم بدلتے ہیں اور خدا جو حکم نازل کرتا ہے اس کو خوب جانتا ہے تو کہتے ہیں کہ تو تو افتراہی کرنے والا ہے۔ حالانکہ ان میں کے بہت سے نہیں جانتے۔ اس آیت کی نسبت سوال یہ ہے۔ کہ قالو سے کون لوگ مراد ہیں۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ قالوا کی ضمیر سے کفار مکہ مراد ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے۔ کہ کفار مکہ نہ اس پہلی آیت کو جو بدلی گئی۔ منزل من اللہ جانتے تھے۔ اور نہ اس دوسری آیت کو جس نے پہلی آیت کو بدلا منزل من اللہ سمجھتے تھے۔

بلکہ صرف یہود و نصارے جو ان احکام قرآن مجید کو جو برخلاف احکام سابق توریت و انجیل کے تھے۔ پیغمبر کا افترا سمجھتے تھے۔ پس قالو کی ضمیر انہیں یہود و نصارے کی طرف پھرتی ہے نہ عام کفار کی طرف جو عموماً بت پرست تھے۔ اور وہ نہ احکام سابق کو مانتے تھے۔ نہ احکام لاحق کو۔ پس صاف ظاہر ہے۔ کہ بدلنا اٰیۃ مکان اٰیۃ سے تبدیل شراء انبیاء سابق مراد ہے نہ تبدیل آیۃ قرآنی کی۔ دوسری آیت سے۔

تفسیر کبیر میں بھی ابو مسلم اصفحانی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ اس آیت میں شرائع سابق انبیاء کا تبدیل ہونا مراد ہے۔ نہ قرآن مجید کے احکام میں ایک سے دوسرے کا منسوخ ہونا۔ اور امام صاحب نے لکھا ہے۔ کہ ابو مسلم اصفہانی برخلاف دیگر مفسرین کے مذہب اسلام میں ناسخ و منسوخ کا بالکل قائل نہیں ہے۔

اور اس میں کچھ شک نہیں ہے۔ کہ اگر ان تمام آیتوں کو جن سے مفسرین اور فقہا نے قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ ہونے کا دعوے پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر سامنے رکھ لیا جاوے۔ اور ان پر غور و تعمق کی نظر ڈالی جاوے۔ اور ان کے سیاق و سباق کو مد نظر رکھا جاوے۔ تو ان سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ یہ آیتیں شرائع سابقہ انبیاء کے بعض احکام کے

تبدیل ہونے سے تعلق رکھتی ہیں۔ نہ قرآن مجید کی آیتوں کے باہم ناسخ و منسوخ ہونے سے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ جن بزرگوں کے پاس ہماری تفسیر کی پہلی جلد موجود ہے وہ اس بیان کو اس صفحہ کے حاشیہ پر درج فرمالیں گے۔ جہاں ہم نے ناسخ و منسوخ پر بحث کی ہے۔

سبع ارضین

یعنی سات زمینیں۔ قال اللہ تعالیٰ۔ اللہ الذی خلق سبع سموات ومن الارض مثلھن۔ یعنی اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا سات آسمانوں کو اور زمینوں کو مثل ان کے۔
اس آیت میں یہ بحث ہے کہ مثلھن سے زمین کو آسمانوں سے کس چیز میں مماثلت ہے۔

ہمارا قول تو یہ ہے کہ اس آیت میں زمین کو آسمانوں سے مماثلت فی الخلق مقصود ہے یعنی جس طرح خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے آسمانوں کو پیدا کیا ہے اسی طرح سے اپنی قدرت کاملہ سے زمین کو پیدا کیا ہے۔

اس آیت میں ارض مفرد آیا ہے بلکہ تمام قرآن مجید میں کسی جگہ ارض بصیغہ جمع یعنی ارضین نہیں آیا۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب ارض پر کسی حیثیت سے جمع کا اطلاق نہیں ہوا تو تعدد ارض نہیں پایا جاتا۔ ولارض میں جو واؤ ہے اس کا عطف سموات پر ہے یعنی خلق الارض مثل خلق السموات بکمال قدرۃ وارادۃ۔ مگر علمائے مفسرین نے یہ معنی اختیار نہیں کئے انہوں نے مثل سے مماثلت فی العدد مراد لی ہے ان علماء کے بھی دو فرقے ہیں۔

ایک فرقہ وہ ہے جو زمین کو تو ایک ہی مانتا ہے مگر اس مماثلت کو طبقات ارض کی مماثلت پر محدود رکھتا ہے یعنی اس کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح آسمان کے طبقے ہیں اسی طرح زمین کے بھی طبقے ہیں۔

تفسیر کبیر میں کلبی کا قول لکھا ہے کہ جس طرح آسمان کے اوپر آسمان پیدا کئے ہیں اسی طرح زمین کے طبقے بھی پیدا کئے ہیں۔ ایک طبقہ تو اس کا خالص مٹی کا ہے اور ایک طبقہ گیلی مٹی کا اور ایک کھلا ہوا طبقہ ہے جس پر دریا اور جنگل ہیں اور ہم لوگ رہتے ہیں۔

بعض عالموں نے خیال کیا ہے کہ اس آیت میں سبع سموات کا لفظ ہے اور ایک جگہ قرآن مجید میں آیا ہے "سبع سموات طباقاً" پس مثلھن سے زمین کے بھی سات طبقے قرار دینا ضروری ہے چنانچہ انہوں نے زمین کی سات اقلیموں کو زمین کے سات طبقے قرار دیئے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ کچھ عجیب نہیں کہ مثلھن سے سات اقلیمیں مراد ہوں مطابق سات آسمانوں کے جن میں سات ستارے ہیں۔

بخاری کی ان حدیثوں میں جو حضرت عائشہؓ اور سعید بن زید سے مروی ہیں کہ جو کسی

کی بالشت بھر زمین غصب کرے گا اس کو خدا تعالیٰ قیامت میں سات زمینوں کا طوق پہنا دے گا۔ اور جو حدیث سالم کے باپ یعنی عبداللہ بن عمر سے بخاری میں مروی ہے کہ غصب کرنے والا کسی کی زمین کا قیامت میں ساتویں زمین تک دھسایا جاوے گا۔

ان حدیثوں میں علما نے سات زمینوں سے سات طبقے زمین کے مراد لئے ہیں۔ چنانچہ فتح الباری میں علامہ ابن حجر نے داؤدی کا قول نقل کیا ہے کہ آسمان کی طرح زمین کے بھی سات طبقے ہیں اور وہ طبقے بلا فصل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور جس عذاب کا ان حدیثوں میں ذکر ہے اگرچہ فتح الباری میں اس کی تصریح لکھی ہے مگر ہم کو اس مقام پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔

غرضیکہ قرآن مجید میں تو مماثلت کی کچھ تصریح نہیں ہے کہ زمین کو آسمانوں سے کس چیز میں مماثلت ہے بلکہ جو کچھ اوپر بیان ہوا وہ صرف علما کی رائے اور اس کا اجتہاد ہے جس میں ہم کو کوئی مقام عذر نہیں ہے۔

امام فخر الدین رازی نے بھی تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ یہ تفسیریں ایسی ہیں جن سے عقل انکار نہیں کرتی۔ اور ان کے سوا جو اور تفسیریں مفسرین نے نقل کی ہیں وہ ایسی ہیں جن کو عقل قبول نہیں کرتی۔

پس بعض علماء نے جو بربناء بعض روایتوں کے مثلھن سے مماثلت فی العدد تصور کر کے یہ قرار دیا ہے کہ سات جداگانہ زمینیں ہیں ہم اس رائے کو اور ان حد ۔ثوں کو نہیں مانتے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔

ترمذی میں سورۃ الحدید کی تفسیر میں ایک بہت بڑی حدیث لکھی ہے اور سات زمین ہونے کے متعلق جو فقرہ اس میں لکھا ہے وہ یہ ہے کہ "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا۔ کہ تمہارے نیچے کیا ہے انہوں نے کہا کہ خدا اور رسول جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ زمین ہے۔ پھر پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ اس کے نیچے کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ خدا اور رسول جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے نیچے ایک دوسری زمین ہے اور ان دونوں میں پانچ سو برس کا رستہ کا فاصلہ ہے۔ اسی طرح سات زمینوں کو گنا کہ ہر زمین میں پانچ سو برس کے رستہ کا فاصلہ ہے پھر آپ نے فرمایا کہ قسم ہے اس شخص کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم ایک رسی نیچے زمین تک لٹکاؤ تو خدا پر جا پہنچے گی پھر آپ نے پڑھی۔ یہ آیت ھو

الاول والآخر والظاهر والباطن وھو بکل شئ علیم۔

خود ترمذی میں لکھا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے کیونکہ حسن بصریؒ نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے اور حسن بصری کا سماع ابو ہریرہ سے ثابت نہیں۔

میزان الاعتدال میں علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ حسن بصری روایتوں کے بیان کرنے میں تدلیس بہت کرتے تھے یعنی اس راوی کا نام لے دیتے تھے جس سے انہوں نے حدیث نہیں سنی۔ اس لئے جب کبھی وہ عن کے لفظ سے کسی صحابی سے حدیث بیان کرتے ہیں (جیسے کہ اس حدیث میں عن ابو ہریرہ کر کے بیان کیا ہے) تو محدثین کے نزدیک اس حدیث سے استدلال کرنا نہایت ضعیف ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب وہ ایسے شخص سے روایت کریں جس کی نسبت محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ حسن بصری نے اس سے حدیث نہیں سنی۔ اور انہیں میں سے ایک ابو ہریرہ ہیں تو ان کی روایت ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے اس کے علاوہ تمام محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو راوی تدلیس کرتا ہو اس کی معنعن روایت مقبول اور قابل احتجاج نہیں ہے۔ پس حدیث خود محدثین کے اصول کے مطابق قابل اعتبار نہیں ہے۔

اور مسند امام احمد بن حنبل میں بھی حدیث باختلاف الفاظ قلیل آئی ہے۔ اس میں بھی حسن بصری کے بالفاظ عن ابی ہریرہ روایت کی ہے اور اس لئے یہ بھی مثل حدیث ترمذی کے قابل سند کے نہیں ہے۔

ایک حدیث مستدرک حاکم میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک زمین سے دوسری زمین تک جو اس کے متصل ہے پانچ سو برس کا راستہ ہے۔

اوپر والی زمین ایک مچھلی کی پشت پر ہے جس کے دونوں کنارے آسمان دنیا سے ملتے ہیں مچھلی ایک پتھر کی چٹان پر ہے پتھر کی چٹان ایک فرشتہ کے ہاتھ پر ہے دوسری زمین وہ ہے جہاں ہوا بند رہتی ہے جب خدا نے قوم عاد کو ہلاک کرنا چاہا۔ تو ہوا کے موکل کو حکم دیا کہ ان پر ہوا بھیجے جس سے وہ ہلاک ہو جائیں۔ موکل نے پوچھا کہ میں اتنی ہوا بھیجوں جتنی کہ بیل کے نتھنے میں سے نکل سکتی ہے۔ خدا نے فرمایا نہیں کیونکہ زمین اور اس کے رہنے والے سب ہلاک ہو جائیں گے۔ تو ان پر اتنی ہوا بھیج دے جتنی کہ انگوٹھی کے حلقے میں سے نکل سکتی ہے۔ اسی کی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ وہ ہوا جہاں سے گذرتی تھی بوسیدہ ہڈی کی طرح چورا کئے بغیر نہیں چھوڑتی تھی۔ تیسری زمین وہ ہے جہاں دوزخ کے پتھر

ہیں چوتھی زمین وہ ہے جہاں دوزخ کی گندھک ہے۔ لوگوں نے پیغمبر خدا سے پوچھا کہ دوزخ میں گندھک بھی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے دوزخ میں گندھک کے دریا ہیں کہ اگر سنگلاخ پہاڑوں پر چھوڑ دیئے جائیں تو وہ پگل کر رہ جاویں۔ پانچویں زمین وہ ہے جہاں دوزخ کے سانپ ہیں جن کے منہ دریا کی وادی کی طرح فراخ ہیں وہ کافروں کو ڈسیں گے۔ اور ان کی ہڈی پر گوشت نہ چھوڑیں گے چھٹی زمین وہ ہے جہاں دوزخ کے بچھو ہیں جن میں سے ادنے بچھو خچروں کے برابر ہیں وہ کافروں کے بدن پر ڈنگ ماریں گے۔ جس کی تکلیف سے وہ دوزخ کی آنچ کی تکلیف بھول جائیں گے۔ ساتویں زمین کا نام سقر ہے جہاں شیطان لوہے کی زنجیروں میں قید ہے ایک ہاتھ آگے اور ایک ہاتھ پیچھے۔ جب خدا اپنے بندوں میں سے کسی پر ان کو بھیجنا چاہتا ہے تو اس کو چھوڑ دیتا ہے۔

مستدرک حاکم ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ یہ حدیث ہم نے منتخب کنزالعمال سے نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں لکھا ہے۔ وتعقب عن ابن عمر یعنی اس روایت کو عبداللہ ابن عمر سے بھی بیان کیا ہے۔ لیکن مستدرک میں حاکم نے پہلی دفعہ اس حدیث کو جس طریقہ سے بیان کیا ہے اس کے اخیر راوی کا نام نہیں لیا پس اس کے راوی دونوں طریقہ سے کوئی ہوں۔ ہم کو معلوم نہیں ہیں اور اس لئے اس حدیث کے سلسلہ روایت پر کوئی بحث روایتاً نہیں ہو سکتی درایتاً ہم اس روایت پر عنقریب بحث کریں گے۔

یہاں تک تو ہم نے ان حدیثوں کی نامعتبری بلحاظ رایوں کے بیان کی ہے لیکن ہمارے نزدیک اور علمائے محققین کے نزدیک بھی سب سے بڑا اصول حدیثوں کے معتبر یا نامعتبر قرار دینے کا۔ درائت ہے جس سے نفس حدیث کے مضمون پر جانچ کی جاتی ہے اگر مضمون حدیث کا ایسا ہو جس کی صحت تسلیم نہ ہو سکے تو بلالحاظ اس بات کے کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نامعتبر وہ حدیث نامعتبر قرار پاوے گی۔ مثلاً کوئی حدیث ایسی ہو جس میں تاریخ مشہور کے خلاف کوئی بات بیان کی گئی ہو۔ یا یہ کہ جو کچھ حدیث میں بیان کیا گیا ہے وہ مخالف مقتضائے عقل ہو یا ایسا امر بیان کیا گیا ہو جس کو حس اور مشاہدہ غلط قرار دیتا ہو یا خود حدیث کے الفاظ یا اس کے معنوں میں رکاکت اور سخافت ہو تو ایسی حدیثیں باعتبار درایت کے نامعتبر قرار دی جاویں گی۔ چنانچہ یہ سب باتیں اور مثل اس کے اور بہت سی شاہ عبدالعزیز صاحب عجالہ نافعہ میں اور امام سخاوی نے فتح المغیث میں اور سیوطی نے تدریب الراوی میں لکھی ہے۔

اب اول تو ان حدیثوں میں جو سات زمینوں کی ہونے کا بیان ہے وہ خود غلط ہے اسلئے کہ سات زمینوں کا وجود دنیا میں نہیں ہے۔ اور علم ہیئت سے خواہ وہ قدیم ہو یا جدید زمین کے تلے اور متعدد زمینوں کا ہونا ثابت نہیں۔

دوسرے ان حدیثوں کے مضمون ایسے رکیک اور سخیف ہیں کہ کسی طرح جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے کیا کوئی شخص اس مضمون کو جو ترمذی اور مسند امام احمد حنبل کی حدیث میں سخیف نہیں قرار دیتا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر کہا اگر تم ایک رسی نیچے کی زمین پر لٹکاؤ تو خدا پر جا پہنچے گی۔ علاوہ اس کے ان حدیثوں میں اور بہت سی رکیک باتیں ہیں جن کو ہم نے چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ زمین کے متعدد ہونے سے متعلق نہیں تھیں۔

مستدرک حاکم میں جو حدیث ہے اس میں لکھا ہے کہ پہلی زمین ایک مچھلی کی پشت پر ہے جس کے دونوں کنارے آسمان دنیا سے ملتے ہیں اول تو یہی غلط ہے کجا زمین کے کنارے اور کجا آسمان۔ ان میں تو زمین اور آسمان کا فرق ہے پھر لکھا ہے کہ مچھلی ایک پتھر پر ہے اور پتھر فرشتہ کے ہاتھ پر ہے۔

دوسری زمین کی نسبت لکھا ہے کہ اس میں ہوا بند رہتی ہے اور جب قوم عاد پر عذاب آیا تھا تو فرشتہ نے پوچھا۔ کہ میں ان پر اس قدر ہوا بھیجوں جس قدر بیل کی ناک میں سے نکل سکتی ہے خدا نے کہا نہیں نہیں یہ تو بہت ہے اتنی بھیج جتنی انگوٹھی کے حلقہ میں سے نکل سکے۔

تیسری زمین دوزخ کے پتھر ہیں۔ اور چوتھی زمین میں گندھک کے دریا ہیں جو دوزخ میں ہوں گے۔ پانچویں زمین میں دوزخ کے سانپ رہتے ہیں اور چھٹی زمین میں دوزخ کے بچھو رہتے ہیں ار ساتویں زمین شیطان لوہے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا قید ہے۔ ایک ہاتھ اس کا آگے ہے اور ایک ہاتھ پیچھے۔ ان سے زیادہ اور رکیک اور سخیف الفاظ اور معانی نہیں ہو سکتے او نہایت افسوس اور ہزار افسوس ان لوگوں پر ہے جو ایسے رکیک اور سخیف الفاظ کو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وَاَنَا اَشْھَدُ بِاللہِ اَنَّ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْم۔

اصل یہ ہے کہ زمینوں کا متعدد ہونا نہ عرب جاہلیت کے خیال میں تھا نہ عیسائیوں اور

یہودیوں کے نہ آتش پرستوں کے اور نہ ان سے پہلے کلدانی' عبرانی' لاطینی' و یونانی قوموں میں تھا۔ شائد ہندوؤں میں ہو مگر صرف قرآن کی اس آیت سے جو اوپر لکھی گئی ہے اور اس میں جو لفظ مثلھن ہے اس پر یہ تمام حدیثیں وضع کی گئی ہیں۔ واللہ ورسولُ بریٌ عن ھذا۔

اور ان حدیثوں سے بھی عجیب تر وہ روایت ہے جو علامہ ابن حجر نے اپنی کتاب فتح الباری میں نقل کی ہے یہ روایت جس کی طرف ہم اشارہ کریں گے ابن حریر نے باسناد شعبہ عن عمرو بن مرہ عن ابی نحی۔ عن ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں جس پر ہم بحث کرتے ہیں مختصر طور پر بیان کی ہے اور حاکم اور امام بیہقی نے باسناد عطا بن السائب عن ابی نحی مطول پر بیان کی ہے۔ اس روایت کے اول الفاظ یہ ہیں "ومن الارض مثلھن" اے سبع ارضین فی کل ارض ادم کادمکم ونوح کنوحکم۔ وابراھیم کابراھیمکم وعیسی کعیساکم ونبی کنبیکم یعنی" من الارض مثلھن" کے الفاظ سے سات زمینیں مراد ہیں ہر ایک زمین میں ایک آدم ہے جیسا کہ تمہارا آدم ہے اور نوح ہے جیسا کہ تمہارا نوح ہے۔ اور ابراہیم ہے جیسا کہ تمہارا ابراہیم ہے اور عیسیٰ ہے جیسا کہ تمہارا عیسیٰ ہے اور نبی ہے جیسا کہ تمہارا نبی ہے۔

اس روایت کو ابن عباس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا۔

ابن جریر اور امام بیہقی اور حاکم کی تصنیفات اس وقت ہمارے پاس موجود نہیں ہیں مگر فتح الباری میں جہاں اس روایت کے ابتدائی الفاظ لکھے ہیں وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ ابن ابی حاتم نے مجاہد کے واسطے سے خود ابن عباس سے روایت کی ہے کہ وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے اگر میں اس آیت کی تفسیر تم سے بیان کروں تو تم کافر ہو جاؤ گے۔ اور تمہارے کافر ہونے کا سبب اس تفسیر کا جھٹلانا اور نہ ماننا ہو گا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مثلھن کی یہ تفسیر تھی جو ان کے دل میں تھی۔ اور جس کو انہوں نے بیان کیا۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول۔ اور جب کہ یہ اثر ابن عباس کا ہے اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے تو اس پر احتجاج کرنا کچھ لازمی نہیں ہے۔

اس اثر کی تائید قران مجید سے کسی طرح نہیں ہوتی کیونکہ تمام قرآن میں ارضین کا لفظ بصیغہ جمع نہیں آیا اور اس آیت میں بھی مفرد کا لفظ ہے۔ نہ جمع کا۔ علاوہ اس کے قرآن مجید کی کسی آیت سے نہیں پایا جاتا کہ خدا نے سات آدم پیدا کئے تھے اور سات نوح اور سات ابراہیم اور سات عیسیٰ اور سات نبی آخر الزمان۔

پس صرف لفظ مثلھن سے سات زمینوں اور سات آدم اور سات ابراہیم اور سات عیسیٰ اور سات نبی آخر الزمان کے ہونے پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ علاوہ اس کے یہ امر خلاف واقع بھی ہے انہیں دلائل سے جو ہم نے حدیث ترمذی کی ذیل میں لکھی ہیں اس روایت کے انکار سے کوئی کافر نہیں ہو سکتا۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ روایت شاذ ہے اگر ہم فرض کرلیں کہ یہ روایت ایسی شاذ ہے کہ حضرت ابن عباس تک اس کی صحیح سند موجود ہے تو بھی بجز اس کے کہ حضرت ابن عباس کے ذہن میں اس آیت کی تفسیر میں یہ امور تھے جو انہوں نے بیان کئے اور کچھ نہیں خیال کرسکتے۔ مگر جب کہ اس کی تائید نہ قرآن مجید سے ہوتی ہے نہ وہ مطابق واقع معلوم ہوتی ہیں تو درایتہ بھی مقبول نہیں ہو سکتی۔ غرضیکہ سات زمینوں کا جداگانہ ہونا کسی طرح پر ثابت نہیں ہے۔

ازواج مطہرات (ناتمام)

رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ازواج مطہرات کے حالات اور جو مختلف روایتیں ان کی نسبت ہیں وہ سب کتب سیرو تواریخ میں مندرج ہیں ہم بہت سی روایتوں کی نسبت بتا سکتے ہیں کہ محض غلط اور نامعتبر ہیں مگر تین امر ایسے ہیں جن کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔

اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کثیرالازواج تھے۔

دوم یہ کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی گیارہ ازواج طاہرات اور ایک یا دو سرایا تھیں اور حضرت خدیجہؓ سب سے پہلی زوجہ مطہرہ تھیں اور جب تک وہ زندہ رہیں آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کسی دوسری کو اپنی زوجیت میں داخل نہیں کیا۔

سوم یہ کہ بعد وفات آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نو بیویاں زندہ تھیں صرف حضرت عائشہؓ ایسی تھیں جن کا پہلے پہل آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عقد ہوا تھا باقی ایسی تھیں کہ جنہوں نے پہلے اور شوہر کر لئے تھے اور ان شوہروں کی وفات کے بعد بحالت بیوہ ہونے کے انخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عقد کیا تھا۔

ان گیارہ ازواج مطہرات کے اور ان دو سرایا کے نام حسب تفصیل ذیل ہیں۔

(۱) خدیجہؓ بنت خویلد (۲) سودہؓ بنت زمعہ (۳) عائشہؓ بنت ابوبکرؓ (۴) حفصہؓ بنت عمرؓ (۵) زینبؓ بنت خویمہ ام المساکین (۶) زینبؓ بنت جحش (۷) ام حبیبؓ بنت ابی سفیان (۸) ام سلمہؓ بنت ابی امیہ (۹) میمونہؓ بنت الحرث (۱۰) صفیہؓ بنت جی ابن اخطب (۱۱) جویریہؓ بنت الحرث

سرایا (۱) ماریہؓ قبطیہ (۲) ریحانہؓ بنت شمعون۔ مگر ہماری رائے میں ریحانہ سے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقاربت نہیں کی۔

ان کے سوائے جو اور روایتیں ہیں اور جن میں آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا کسی سے عقد کرنا اور کسی کو بغیر مقاربت کے چھوڑ دینا یا کسی سے خطبہ یعنی منگنی کرنا وغیرہ بیان ہوا ہے۔ ان میں سے ایک روایت بھی اس قابل نہیں ہے کہ اس پر پورا اعتماد کیا جائے۔ کیونکہ ان روایتوں کی صحت ثابت نہیں ہوتی۔ اہل سیر تمام روایتوں کا خواہ وہ صحیح د

ثابت ہوں یا نہ ہوں اپنی کتاب میں جمع کر دینا چاہتے ہیں اور اس بات کی تنقیح کہ ان میں سے کون سی صحیح و ثابت ہے پڑھنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں پس معترضین کی بڑی غلطی ہے کہ اس قسم کی روایتوں کو اپنے اعتراضوں کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

مخالفین مذہب کا اعتراض دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی کثرت ازدواج پر ہے اس اعتراض کا یہودیوں یا عیسائیوں اور بت پرست قوموں کی طرف سے ہونا تعجب انگیز ہے کیونکہ توریت یا صحف انبیا یا انجیل میں تعداد ازدواج کا امتناع نہیں پایا جاتا۔ اور بت پرست قوموں میں تعداد ازدواج کا رواج ہے پھر کیا سبب ہے کہ وہ لوگ تعداد ازدواج پر معترض ہوں مگر یہ ایک جواب الزامی ہے جو ہماری نگاہ میں چنداں وقعت نہیں رکھتا اس لئے ضروری ہے کہ ہم حقیقت امر کے بیان کرنے پر متوجہ ہوں۔

کثرت یا تعداد و ازدواج پر یا طلاق کے جائز ہونے پر جو لوگ عقلی یا اخلاقی یا تمدنی لحاظ سے اعتراض کرتے ہیں ان سے بہت زیادہ اعتراض اس پر ہوتے ہیں جب ایک زوجہ کے سوا دوسری زوجہ کرنے کا امتناع ہو اور بجز زنا کے اور کسی حالت میں طلاق دینا جائز نہ ہو پس اس پر مخالف یا موافق کا قلم فرسائی کرنا محض بے سود ہے۔ بلکہ عقلاً اور انصافاً عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ہر ایک پہلو پر اور جو نقصان عقلی اور تمدنی ان دونوں صورتوں میں واقع ہوتے ہیں ان پر غور کر کے ایک درجہ توسط اختیار کیا جائے تاکہ جہاں تک ممکن ہو ان دونوں صورتوں میں جو عقلی اور اخلاقی اور تمدنی نقصان ہیں ان میں کمی واقع ہو ہمارے نزدیک مذہب اسلام میں ایک متوسط درجہ اختیار کیا ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اس سے ان تمام نقصانوں میں اور بالخصوص اخلاقی نقصان میں بہت کچھ کمی ہو گئی ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام بھی بشر تھے خود قرآن مجید میں ہے کہ خدا نے انخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ تو یہ کہہ دے کہ "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ" مگر انبیاء میں ایسے اوصاف ہوتے ہیں جو اعلیٰ ترین بشر میں ہونے چاہئیں۔ اور وہ اوصاف تین قسم پر منقسم ہو سکتے ہیں۔

اوّل۔ ذات خاص انبیاء علیہم السلام میں مثل صداقت نیکی، تمکین، وقار خلق وغیرہ جس سے انسان اپنی قوم یا سوسائٹی میں معزز مکرم، محترم گنا جاتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نسبت فرمای کہ "فَبِمَا رَحْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنْتَ لَھُمْ وَلَوْ

كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔

دوم۔ انبیاء ایسے افعال میں مبتلا نہ ہوں جو ان کی قوم یا سوسائٹی میں معیوب اور باعث ذلت و حقارت ہوں کیونکہ ایسے افعال سے وہ خود اس لائق نہیں رہتے کہ قوم ان کی عزت کرے۔ اور ان کو ناصح شفیق سمجھے۔

سوم۔ جن امور کو انبیاء معصیت اور گناہ بتاتے ہیں اور لوگوں کو ان سے ڈراتے ہیں خود ان امور میں مبتلا نہ ہوئے ہوں جو قول ہو وہی فعل ہو ظاہر و باطن دونوں یکساں ہوں ورنہ وہ اس قابل نہیں رہتے کہ لوگوں کو اس کی نصیحت کریں جن میں وہ خود مبتلا ہیں۔ پس انبیاء کے معصوم ہونے کے یہی معنی ہیں کہ وہ ان تینوں نقصانوں سے بری ہوتے ہیں۔

کثرت ازدواج ایسا امر نہیں ہے کہ جس خاص امر کے لئے انبیاء مبعوث ہوتے ہیں اس کے مخالف یا اس میں خلل انداز ہو البتہ اس کو کسی حد تک محدود کرنا تمدنی لحاظ سے مفید ہے جیسا کہ مذہب اسلام نے کیا۔

عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں اور یہودیوں میں کثرت ازدواج کوئی امر معیوب نہ تھا اور جب تک کہ حکم تحدید ازدواج صادر نہیں ہوا۔ اس وقت تک کثرت ازدواج کے لئے کوئی امر مانع نہ تھا۔ اور جس معاہدہ سے ایک عورت سے معاملہ زناشوئی جائز رکھا جاتا تھا کوئی وجہ نہ تھی کہ متعدد عورتوں سے بھی اسی قسم کے معاہدہ سے معاملہ زناشوئی جائز نہ ہو۔ البتہ عورتیں جو اس معاہدہ کے لئے محل تھیں اس قسم کا معاہدہ دوسرے سے نہیں کر سکتی تھیں۔ پس کثرت ازدواج جب تک کہ تحدید ازدواج کا حکم نہ ہوا ایسا کوئی فعل نہیں ہے کہ جس کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یا انبیاء سابقین پر نکتہ چینی کی جاوے۔ دلائل عقلی اور نیز قرآن مجید کے تمام احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر احکام ہوتے ہیں کسی امر کے امتناع' یا کسی امر کے جواز کے' وہ آئندہ زمانہ سے یعنی اس حکم کے صادر ہونے کے زمانہ مابعد سے علاقہ رکھتے ہیں۔ اس حکم کے قبل کے زمانہ سے۔ پس جس جس پاس متعدد ازدواج تھیں اس پر کوئی نکتہ چینی نہیں ہو سکتی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کسی عورت کو اپنی زوجیت میں نہ لانا ان کے تقدس کو جو بہ سبب نبی اور صاحب کتاب ہونے کے تھا کچھ زیادہ نہیں کر دیتا۔ کیونکہ اس کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تمام یہودی نعوذ باللہ اولاد جائز نہیں سمجھتے تھے۔ پس ان کے ساتھ

کسی یہودن کا عقد ہونا ممکن نہ تھا- اور یہودی دوسری قوم کی عورت سے عقد نہیں کرتے تھے- معہذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی عمر کا زمانہ مہاجرت میں گذرا اور آخیر زمانہ کچھ بہت طویل نہ تھا- کیونکہ صرف تینتیس برس کی عمر میں آپ نے وفات پائی اور اس وقت تک صرف ستر آدمی آپ پر ایمان لائے تھے-

عرب جاہلیت میں باپ کی دوسری جورو کو اور دو حقیقی بہنوں کو ایک ساتھ زوجیت میں لانے کا عام دستور تھا- علاوہ ان کے بجز بیٹے کی جورو یا متبنیٰ کی جورو اور چند قریب رشتہ داروں کے کچھ تمیز اس بات کی نہ تھی کہ کونسی رشتہ دار عورتیں ایسی ہیں جو زوجیت میں نہیں آسکتیں-

مگر خدا نے مسلمانوں کو بتایا کہ جن عورتوں کو تمہارے باپ نے زوجیت میں داخل کیا ہو ان کو تم اپنی زوجیت میں نہ لاؤ- اس کے بعد بتلایا کہ تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور تمہارے بھائی کی بیٹیاں یعنی بھتیجیاں اور تمہاری بہن کی بیٹیاں یعنی بھانجیاں اور تمہاری دودھ پلائیاں کہ تمہاری ماؤں کی مانند ہیں اور تمہاری دودھ شریک جو مثل بہنوں کے ہیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں یعنی ساسیں اور وہ لڑکیاں جو تمہاری جوروئیں اپنے ساتھ لاویں جن سے تم نے مقاربت کی ہو اور تمہاری صلبی بیٹوں کی جوروئیں اور دو بہنوں کو ایک ساتھ زوجیت میں داخل کرنا تم پر حرام ہے-

ان دونوں مقاموں میں جن میں عورتوں کو زوجیت میں لانے سے منع کیا گیا ہے الفاظ الا ماقد سلف کے آئے ہیں- جس کے معنی صاف یہ ہیں کہ اس حکم سے پہلے جو ہوا سو ہوا- چنانچہ آیت مذکور یہ ہے-

ولا تنکحوا ما نکح اٰباء کم من النساء الا ماقد سلف انہ کان فاحشۃ ومقتا وساء سبیلا- حرمت علیکم امہٰتکم و بنٰتکم و اخوٰتکم و عمٰتکم و خٰلٰتکم و بنٰت الاخ و بنٰت الاخت و امہٰتکم التی ارضعنکم و اخوٰتکم من الرضاعۃ و امہٰت نسائکم و ربائبکم التی فی حجورکم من نسائکم التی دخلتم بھن فان لم تکونوا دخلتم بھن فلا جناح علیکم وحلائل ابنآئکم الذین من اصلابکم و ان تجمعوا بین الاختین الا ماقد سلف ان اللہ کان غفورا رحیما- سورۃ نساء ایت ۲۶، ۲۷-

الفاظ الا ماقد سلف سے یہ مراد ہے کہ جن لوگوں نے قبل نزول اس آیت کے ان

محرمات میں سے جن کا ذکر اس آیت میں ہے کسی کو زوجیت میں داخل کر لیا تھا اور وہ امر گذر بھی گیا اور اب موجود نہیں ہے تو اس پر کچھ مواخذہ نہیں ہے۔ لیکن اس آیت کے اترنے کے بعد اگر ان محرمات میں سے کوئی عورت کسی کی زوجیت میں موجود ہے تو اس کی تفریق لازم ہے کیونکہ وہ الا ماقد سلف میں داخل نہیں ہے۔ رسول خدا صلی اللہ و آلہ وسلم کی ازدواج میں کوئی ایسی عورت نہیں تھی جو ان محرمات میں سے ہو۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کسی کو اس بات پر رہنے نہیں دیا کہ اس کے باپ کی جورو اس کی زوجیت میں رہے۔ اگرچہ زمانہ جاہلیت میں اس نے اپنے باپ کی جورو کو اپنی زوجیت میں لیا ہو۔ اور براء سے ایک روایت لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ابو ہودہ کو ایک شخص کے پاس روانہ کیا جس نے اپنے باپ کی جورو کو اپنی جورو بنا لیا تھا تاکہ اس کو قتل کر ڈالے اور اس کا مال چھین لے۔

رسول خدا صلی اللہ و آلہ وسلم کی زوجیت میں جو عورتیں آسکتی تھیں خدا نے قرآن مجید میں ان کو اس طرح بتایا ہے۔

۱۔ وہ بیویاں جن کا مہر دیا جاوے یعنی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عقد میں آویں۔

۲۔ جو بطور فَے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آویں۔

۳۔ چچا کی بیٹیاں۔ پھوپھی کی بیٹیاں۔ ماموں کی بیٹیاں۔ خالہ کی بیٹیاں (جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علی و آلہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی)۔

۴۔ کوئی مسلمان عورت اگر اپنا نفس پیغمبر کو ہبہ کر دے یعنی بے مہر نکاح میں آنا چاہے اور پیغمبر اس سے نکاح کرنا چاہیں۔ مگر یہ حکم سوائے مسلمانوں کے خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے واسطے ہے اور وہ آیت یہ ہے۔

یَا یّھَا النَّبیُ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَکَ ازواجک الّتیٓ اٰتیت اجورھُنَّ وَمَا مَلَکَتْ یَمِینُکَ مِمَّا افاء اللہ علیک و بنات عَمِّکَ و بنات عماتکَ و بنتِ خالک وَبَنَاتِ خالاَتِکَ الّتی ھَاجرن معک وامراۃً مومنۃ ان وھبت نفسھا للنّبیّ ان اراد النبی ان یستنکحھا خالصۃ لک من دون المومنین۔ سورۃ احزاب آیہ ۴۹

ان دونوں آیتوں میں جو حکم مسلمانوں کے لئے ہے اور جو حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے لئے ہے اس میں بجز اس حکم کے جو نمبر ۴ میں بیان ہوا ہے اور کسی میں کچھ فرق نہیں ہے۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت رشتہ داروں سے نکاح کرنے میں یہ قید زیادہ لگی ہوئی ہے کہ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی ہو۔ حالانکہ مسلمانوں کو رشتہ دار عورتوں سے نکاح کرنے میں یہ قید نہیں ہے۔

باقی رہا یہ امر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے جس نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیا ہو۔ یعنی بے مہر نکاح کیا ہو۔ اور ایسی اجازت اور کسی مسلمان کو نہیں دی گئی۔ مگر یہ امر کچھ ایسا مہتم بالشان نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی امر بدگمانی کا جیسا کہ مخالفین مذہب اسلام خیال کرتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ خود عورت کا درخواست کرنا کہ میں بغیر کسی مہر کے نکاح میں آنا چاہتی ہوں ان تمام بدگمانیوں کو رفع کرتا ہے۔ جو مخالفین مذہب اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت کرتے ہیں۔

مگر عام مسلمانوں کو بھی ایسی اجازت دینا آیندہ کے بہت سے تنازعات کا باعث تھا۔ جب کوئی عورت اپنے مہر کا دعویٰ کرتی تو شوہر کو اس عذر کا بہت موقع ملتا۔ کہ اس نے اپنا نفس مجھ پر ہبہ کر دیا ہے یعنی بلا مہر میرے ساتھ نکاح کیا ہے اس لئے نہایت ضروری تھا کہ اس بات کی تصریح کر دی جاوے کہ یہ حکم خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہے مسلمانوں کے لئے نہیں ہے۔

مخالفین مذہب اسلام کہتے ہیں کہ سورۃ نساء کے ابتدا میں جو آیت ہے اس سے تمام مسلمانوں کو چار جوروں سے زیادہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں کے پاس چار جوروں سے زیادہ تھیں تو اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ چار سے جو زیادہ ہیں ان کو علیحدہ کر دو۔ چنانچہ ابو داؤد اور ابن ماجہ میں ہے کہ قیس ابن الحرث جب مسلمان ہوا۔ تو اس کے پاس آٹھ جوروئیں تھیں۔ جب اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا تو آپ نے اس کو حکم دیا کہ ان میں سے چار کو رکھو۔ اور ابن ماجہ اور ترمذی میں ہے کہ جب غیلان الثقفی مسلمان ہوا تو اس کے پاس دس عورتیں تھیں اور وہ سب کی سب اس کے ساتھ مسلمان ہو گئی تھیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو حکم دیا کہ ان میں سے چار کو چن لو۔ یعنی باقی کو

چھوڑ دو۔ مگر خود آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے چار سے زیادہ اپنی ازدواج مطہرات رکھیں۔ یہاں تک کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو نو بیویاں زندہ موجود تھیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان عورتوں سے جو آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی زوجیت میں آچکی ہوں دوسروں کو نکاح کرنے سے منع کیا تھا اور وہ آیت یہ ہے ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابداً۔ یعنی اے مسلمانو! پیغمبر خدا کی جوروؤں سے اس کے بعد کبھی نکاح مت کرو۔ بعد کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے اس کی نسبت مفسروں نے لکھا ہے کہ من بعدہ سے مراد بعد وفات رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم ہے۔ حالانکہ آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے کہ "بعد" سے بعد وفات مراد ہو۔ اور اگر بعد سے بعد وفات مراد لی جاوے تو یہ معنی ہونگے کہ زمانہ حیات آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم میں ان کی ازدواج سے جن کو آپ نے چھوڑ دیا ہو نکاح جائز ہو گا پس کیسی مہمل بات ہے کہ جو فعل آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی وفات کے بعد ناجائز ہو وہ آپ کی حیات میں جائز قرار دیا جاوے۔ پس من بعدہ کے معنی ہیں بعد ازدواجہ یعنی بعد اس کے کہ وہ عورت زوجیت آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم میں آچکی ہو اس سے کسی مسلمان کو نکاح جائز نہیں۔ پس سبب یہ تھا کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کسی زوجہ کو اپنی زوجیت سے خارج نہیں کر سکتے تھے (اور یہ بات آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے کسی زوجہ کو طلاق دی تھی کسی طرح ثابت نہیں جس کو ہم بیان کرینگے) مگر مسلمانوں کی عورتوں سے یہ حکم متعلق نہ تھا۔ اس لئے خود آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے اپنی تمام ازدواج کو قائم رکھا۔ اور جن مسلمانوں کے پاس چار عورتوں سے زیادہ نکاح میں تھیں ان کی نسبت فرمایا کہ چار کو رہنے دو اور ان سے جو زیادہ ہوں ان کو چھوڑ دو۔

کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ کیوں ایسا حکم نازل ہوا ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی زوجیت میں جو عورت آگئی ہو۔ اس سے پھر کوئی شخص نکاح نہیں کر سکتا۔ مگر یہ حکم نہایت عمدہ ہے اگر اس کا امتناع نہ ہوتا تو اسلام میں نہایت فتور واقع ہوتا۔ یہ عورتیں اپنے نئے خاوند کے سبب اور ان کے مطلب کے موافق سینکڑوں حدیثیں اور روایتیں رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی بیان کرتیں جن سے ایک فتنہ عظیم اسلام میں برپا ہوتا۔ اور اسلام میں باعث فتور اور اس کے احکام میں اختلال کا سبب ہوتا۔ اس لئے یہ حکم نہایت ضروری تھا کہ جو عورتیں آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی زوجیت میں آچکی ہیں وہ

دوسروں سے نکاح نہ کرنے پاویں۔

ان تمام اعتراضوں سے مخالفین مذہب اسلام کا یہ مقصد ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نسبت نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے کا الزام لگائیں۔ مگر جو احکام آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نسبت قرآن مجید میں ہیں ان کے جاننے کے بعد کون شخص اس الزام کو صحیح مان سکتا ہے؟

سورۃ احزاب میں یہ آیت ہے لا یحل لک النسآء من بعد ولا ان تبدل بھن من ازواج ولوا عجبک حسنھن یعنی جس قدر ازواج موجود ہیں اس کے بعد تیرے لئے عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ یہ بات تیرے لئے حلال ہے۔ کہ ان کی جگہ اور جوروں کو بدل لے گو کہ تجھ کو ان کا حسن اچھا معلوم ہو۔ پس جو شخص کہ خواہش نفسانی کے پورا کرنے کا آرزو مند ہو وہ ایسی قیدیں اپنے ساتھ لگا سکتا ہے کہ نہ تو وہ کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لا سکے اور جو جورو دیں موجود ہیں نہ ان کے بدلے میں اور جورو لا سکے۔ پس کیسا غلط خیال ہے جو معترضیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نسبت خیال کرتے ہیں۔

بعض مفسرین نے ولا ان تبدل کے لفظ سے جو اس آیت میں ہے یہ سمجھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنی ازواج کو طلاق دینا جائز نہیں رہا تھا۔ کیونکہ تبدل ازواج اسی طرح پر ہو سکتا ہے کہ ایک کو زوجیت سے خارج کیا جائے۔ اور دوسری کو اس کی جگہ لیا جائے اور یہ امر بغیر اس کے کہ ایک کو طلاق دی جائے نہیں ہو سکتا۔ پس گویا اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ازواج میں سے کسی زوجہ کو طلاق دینا جائز نہیں رہا تھا جو نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے کے بالکل خلاف ہے۔

اگر یہ قول مفسرین کا صحیح ہو تو اس بات کا سبب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے باوصف محدود ہو جانے تعداد ازواج کے کیوں چار سے زیادہ ازواج اپنے پاس رہنے دیں بہت عمدگی سے واضح ہو جاتا ہے۔

معترض کہہ سکتا ہے کہ تم نے جو یہ بات قرار دی ہے کہ ان لا تبدل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو طلاق دینا منع ہو گیا تھا یہ غلط ہے اس لئے کہ سورۃ طلاق میں صاف لکھا ہے کہ یا ایھا النبی اذا طلقتم النسآء الخ اور اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو طلاق دینے کی صاف اجازت پائی جاتی ہے مگر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ تمام

قرآن مجید میں جہاں پیغمبر کو یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ کر کے خطاب کیا ہے اس کے بعد صیغہ واحد حاضر کا آیا ہے جیسے کہ یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ۔ اور یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ۔ مگر صرف سورۃ طلاق کی آیت میں یہ سیاق بدل دیا ہے اور اس میں یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ کے بعد کہا ہے اذا طلقتم جمع کے صیغہ سے۔ پس اس تبدیل سیاق پر غور کرنا ضروری ہے۔ اس تبدیل سیاق کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب نہیں ہیں۔ بلکہ مسلمان مخاطب ہیں اور تقدیر آیت کی یہ ہے یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ قل للمومنین اذا طلقتم النساء الخ اور جو کہ مسلمان مخاطب تھے اس لئے صیغہ جمع کا آیا ہے۔

بخاری میں عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی جورو کو اس ناپاکی کے زمانہ میں جو ہر مہینہ عورتوں کو ہوتی ہے طلاق دیدی تھی اس کی نسبت حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا۔ اس میں یہ آیت سورۃ طلاق کی نازل ہوئی۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ عمر بن سعید اور عتبہ بن غزوان نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ پس اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ازواج کو طلاق دینے کا اختیار ثابت نہیں ہوتا۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کو جو حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں مذکورہ بالا حالت میں طلاق دیدی تھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی ہے یہ کہنا ان کا اس لئے غلط ہے کہ اگر حفصہؓ کی طلاق کے سبب یہ آیت خاص رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت نازل ہوتی تو طلقتم صیغہ جمع کا نہیں آسکتا تھا۔

ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس روایت میں حضرت حفصہؓ کا طلاق دینا بیان ہوا ہے اس میں راوی کو غلطی ہوئی ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے اس کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تھا۔ پس راوی یہ سمجھا کہ حضرت عمرؓ کی بیٹی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طلاق دیدی ہے۔ حالانکہ عبداللہ بن عمر نے اپنی جورو کو طلاق دیدی تھی۔ نہ پیغمبر خدا نے حفصہؓ کو جو حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں۔

اور سورۃ تحریم میں یہ آیت ہے عَسٰی رَبُّہٗ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَہٗ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْکَارًا۔ یعنی اگر پیغمبر تم کو طلاق دے دے تو قریب ہے خدا اس کے بدلے میں ایسی بیویاں دے جو تم سے بہتر ہوں اور جو مسلمان ہوں اور جو

ایمان والیاں دعا کرنے والیاں۔ توبہ کرنے والیاں۔ عبادت کرنے والیاں۔ روزہ رکھنے والیاں اور بیاہی اور بن بیاہی ہوں۔

اس آیت کو یہ قرار دینا کہ اس آیت سے پایا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو طلاق دینے کی اجازت تھی محض غلط ہے کیونکہ یہ آیت حکم پر کسی طرح دلالت نہیں کرتی۔ بلکہ اس میں شرط اور تعلیق ہے اور اس سے مقصود خوف دلانا اور قدرت کا ظاہر کرنا ہے نہ یہ جتانا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ازواج کو طلاق دے سکتے ہیں یا ان کو طلاق دینی چاہئے۔ چنانچہ تفسیر کبیر اور لباب التاویل میں صاف لکھا ہے کہ ھذا من باب الخبار رعن القدرہ لا عن الکون لانہ قال ان طلقکن وقد علم انہ لا یطلقھن فاخبر عن قدرتہ انہ ان طلقھن ابدلہ ازواجا خیرا منھن تخویفا لھن۔ یعنی اس آیت میں خدا نے اپنی قدرت کی خبر دی ہے نہ کسی امر کے واقع ہونے کی۔ کیونکہ اس نے فرمایا کہ اگر وہ تم کو طلاق دے دے اور یہ تو پہلے سے معلوم تھا کہ پیغمبر اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دینے کے اس سے معلوم ہوا کہ خدا نے محض اپنی قدرت جتائی ہے کہ اگر پیغمبر اپنی بیویوں کو طلاق دیدیں تو خدا ان بیویوں سے بہتر عورتیں ان کے بدلہ میں دے گا۔ اور یہ اصل میں ان کو خوف دلانے اور ڈرانے کے طور پر کہا ہے۔ پس یہ آیت کسی طرح اس لائق نہیں ہے کہ اس سے اس امر پر استدلال کیا جاوے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو طلاق دینے کی اجازت تھی۔

جب یہ آیت نازل ہوئی اور اس کا چرچا لوگوں میں پھیلا تو لوگوں نے یہ غلط خیال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی کل ازواج کو طلاق دے دی ہے حضرت عمرؓ نے جب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے کسی کو بھی طلاق نہیں دی۔ حضرت عمرؓ نے آپ سے اجازت لے کر مسجد کے دروازہ پر بلند آواز میں کہا کہ یہ خبر غلط ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کسی بیوی کو طلاق نہیں دی۔

سورۃ احزاب میں یہ آیت ہے یَا یُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِکَ اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ الحیوۃ الدنیا و زینتھا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحا جمیلا وان کنتن تردن اللہ و رسولہ والدار الاخرۃ فان اللہ اعد للمحسنات منکن اجرا عظیما۔ یعنی اے پیغمبر تم اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی کو پسند کرتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ دے دلا کر اچھی طرح رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کو اور آخرت کو پسند کرتی ہو تو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ خدا نے تم

میں سے نیکی کرنے والیوں کے لئے بڑا ثواب ٹھہرایا ہے۔

یہ آیت۔ آیت تخییر کہلاتی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی ازواج کو اختیار دیا گیا تھا کہ چاہیں وہ دنیا کو اختیار کریں چاہیں دین کو مگر یہ آیت اس آیت سے پہلے نازل ہوئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو طلاق دینے کا امتناع ہوا ہے اور جس کو ہم پہلے لکھ آئے ہیں اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے۔

اس آیت میں بھی مہر کا ذکر ہے اور سورۃ احزاب کی آیت اتیت اجورھن میں بھی مہر کا ذکر ہے اور سورۃ احزاب کی آیت قد علمنا ما فرضنا علیھم فی ازواجھم میں بھی لفظ ما سے مہر مراد ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیات سورۃ احزاب سے پہلے ازواج کے لئے مہر مقرر ہو چکا تھا اور جس آیت میں مہر مقرر ہونے کا ذکر ہے وہ سورۃ نساء کی آیت ہے۔ پس صاف پایا جاتا ہے کہ سورۃ نساء کی آیت قبل آیات سورۃ احزاب نازل ہو چکی تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے بعد نزول آیت سورۃ نساء بھی عورتوں سے نکاح کیا۔ حضرت زینبؓ بن جحش سے جن کا ذکر خود سورۃ احزاب میں ہے ۵ ہجری میں نکاح ہوا۔ اور اس کے بعد بھی ۷ ہجری تک نکاح ہوتا رہا۔ پس کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے بعد نزول آیت سورۃ نساء کے جس میں چار ازواج کرنے کا حکم ہے اور عورتوں سے نکاح کیا۔ مگر اس دلیل میں یہ غلطی ہے کہ معترض نے یہ سمجھا ہے کہ ازواج کے مہر کا تقرر اسی وقت ہوا تھا۔ جب کہ تحدید ازواج کا حکم سورۃ نساء میں نازل ہوا ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے عرب جاہلیت میں بہت سی باتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی باقی تھیں اور عرب جاہلیت میں بھی زوجہ کے لئے مہر مقرر کرنا یا اس کو دیدینے کا عام رواج تھا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا نکاح حضرت خدیجہ کے ساتھ ۲۸ برس قبل ہجرت کے ہوا تھا۔ یعنی اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم مبعوث بھی نہیں ہوئے تھے اس وقت بھی مہر مقرر ہوا اور سونے کے ساڑھے سات اوقیہ کے برابر مہر دیا گیا نبوت کے بہت زمانہ بعد تحدید ازواج کا حکم نازل ہوا ہے۔ پس سورہ نساء اور سورۃ احزاب کی آیتوں میں مہر کے ذکر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جب تحدید ازواج کا حکم نازل ہوا ہے اسی کے ساتھ مہر کے مقرر کرنے کا بھی حکم ہوا تھا۔

بلکہ نہایت قرین قیاس ہے کہ آیت سورۃ نساء درباب تحدید ازواج مسلمانان اور

نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آیت سورۃ احزاب لا یحل لک النساء قریب قریب زمانہ میں نازل ہوئی ہیں۔ایک میں مسلمانوں کے لئے ازواج کی تحدید ہے اور دوسری میں پیغمبر کی نسبت آئندہ کسی عورت سے نکاح کرنے کا امتناع ہے۔

ہم نے کہا ہے کہ قرین قیاس ہے کہ وہ دونوں آیتیں قریب قریب نازل ہوئی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زمانہ نزول آیت کا تحقیق ہونا نہایت مشکل امر ہے قرینہ اور قیاس سے اسکا زمانہ قرار دیا جاتا ہے مفسرین اور اہل سیر نے جو زمانے نزول آیت کے قرار دیئے ہیں یا شان نزول آیات بیان کی ہیں ان میں سے اکثر مطلق قابل اعتبار کے نہیں ہیں۔اس لئے کہ اس کی اسناد کافی نہیں ہیں۔

سورۃ احزاب میں ایک خاص حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تھا کہ اگر کوئی عورت بلا مہر نکاح کرنے کی درخواست کرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس سے نکاح کرنا چاہیں تو بلا مہر نکاح کر سکتے ہیں۔اس اجازت کی نسبت خدا نے کہا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے مقرر کیا ہے مسلمانوں پر ان کی ازواج میں یعنی مہر کا دینا۔ لیکن ہم نے جو یہ کہہ دیا کہ بلا مہر نکاح کرنے کا حکم خاص تمہارے لئے ہے۔اس لئے کہدیا کہ تم کو اس میں کچھ تردد یعنی دل میں کچھ دھکڑ پھکڑ نہ رہے۔ تفسیر ابن عباسؓ میں لفظ حرج کی تفسیر میں لفظ ماثم لکھا ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہے مگر لفظ حرج سے اس مقام پر سہولت اور آسانی مراد لینا ٹھیک نہیں ہے۔

لفظ فرض اور فریضہ کے معنی ہیں مقرر کرنے کے۔فقہانے جو الفاظ فرض۔واجب۔ سنت۔ مستحب واسطے تفریق و تقسیم احکام شرعی کے بطور اصلاح اختیار کئے ہیں ان معنوں میں فرض کا لفظ قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا ہے۔پس جن لوگوں نے فرضنا اور فریضہ کے لفظ سے وہ معنی سمجھے ہیں جو فقہانے اپنی اصلاح میں قرار دیئے ہیں تو سمجھنے والوں نے ان کے معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے اور ہرگاہ مہر کا تقرر ابراہیمی شریعت کا باقی ماندہ حکم تھا۔ جیسے حج۔اور غسل جنابت وغیرہ تو خدا کا یہ کہنا کہ قد علمنا ما فرضنا علیھم فی ازواجہم بالکل ٹھیک اور واضح تھا۔

سورۃ احزاب میں ایک اور آیت ہے جس میں خدا نے اپنے رسول کو کہا ہے کہ اپنی ازواج میں سے جس کو چاہئے علیحدہ رکھے اور جس کو چاہے اپنے پاس رکھے اور جس کو علیحدہ

رکھا ہے اگر اس کو اپنے پاس بلانا چاہے تو کچھ گناہ نہیں ہے اور وہ آیت یہ ہے۔ تُرجیُ منُ تشاءُ منھُنّ وتوُیٔ الیک من تشاء ومن ابتغیت ممن عزلت فلا جناح علیک۔

اس آیت سے اکثر مفسرین نے سمجھا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر باری باری سے اپنے ازواج کے پاس رہنا واجب تھا۔ اور اس آیت سے باری باری اپنی ازواج کے پاس رہنا واجب نہیں رہا۔ اس میں شک نہیں کہ جب متعدد ازواج ہوں تو بلاشبہ شوہر کو لازم ہے کہ باری باری سے ان کے پاس رہے مگر ہم کو قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت نہیں ملی جس سے بالتصریح باری باری سے رہنا واجب قرار دیا ہو۔ سورۃ نساء کی آیت میں جو یہ الفاظ ہیں۔ کہ فان خفتم ان لا تعدلوا لفظ لا تعدلوا سے ازواج میں عدل کرنا واجب ٹھیرایا ہے اور باری باری سے ازواج کے پاس رہنا بھی عدل میں دخل کیا ہے مگر یہ صرف ایک ایسا حکم ہے کہ آیت کے الفاظ سے استنباط کیا ہے۔ مگر نص نہیں ہے۔

تعدد ازواج میں ازواج کی حالت بلحاظ طبیعت انسانی یکساں نہیں رہتی۔ انسان کو بیماریاں غیر متوقع لاحق ہو جاتی ہیں جن سے عورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں علاوہ اس کے خود عورتوں کی طبعی حالت یکساں نہیں رہتی۔ پس ایسی حالت میں باری کا التزام نہیں ہو سکتا۔ اسی واسطے خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اجازت دی ہے کہ ازواج میں سے جس کو چاہو علیٰحدہ رکھو اور جس کو چاہو اپنے ساتھ۔ اور جس کو علیٰحدہ رکھا ہے اس کو پھر اپنے پاس بلالو۔ پس یہ کوئی ایسا امر نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر اس کے سبب سے کوئی نکتہ چینی کی جاوے۔ کیونکہ یہ حکم طبیعت انسانی کے موافق ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلمؐ سے اور تمام انسانوں سے یکساں متعلق ہو سکتا ہے۔

اب ہم ازواج مطہرات کا مختصر تاریخی حال بیان کرتے ہیں اور جو نکتہ چینی ہر ایک کی نسبت کی گئی ہے اس کی تحقیق کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ حضرت خدیجہؓ کے باپ کا نام خویلد ہے اور وہ قوم قریش میں سے تھیں ان کی ماں کا نام فاطمہ بنت زائدہ ہے۔ نوفل ان کا چچا تھا اور نوفل کا بیٹا ورقہ ان کا چچا زاد بھائی تھا۔ اور حضرت خدیجہؓ ۶۸ سنہ قبل ہجری میں پیدا ہوئیں۔

پہلے حضرت خدیجہؓ کا نکاح ابو ہالہ بن زراہ سے ہوا تھا اور اس سے دو بیٹے پیدا ہوئے ایک کا نام ہند اور دوسرے کا نام ہالہ تھا جب ابو ہالہ مر گیا تو حضرت خدیجہؓ نے عتیق بن عایذ

سے نکاح کیا جو قریش کے قبیلہ بنی مخزوم سے تھا اور اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ہند تھا۔ حضرت خدیجہؓ کا باپ بہت امیر تھا اور ان کے ہاں تجارت ہوتی تھی۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لیکر بصرہ میں گئے اور اس مال کو بہت نفع سے فروخت کیا اور واپس آکر اس سے بہت زیادہ نفع ان کو دیا جو اور لوگ دیتے تھے۔

جبکہ عتیق بن عائذ دوسرا شوہر بھی مر گیا تو حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ۲۸ قبل ہجری میں نکاح کیا یہ بات سچ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دولت مند نہیں تھے مگر ایک نہایت اعلیٰ خاندان قریش سے تھے اور ان کی امانت اور دیانت اور سچائی عام طور سے لوگوں میں مشہور تھی۔ اور ان کا لقب امین عرب ہو گیا تھا۔ اس سبب سے حضرت خدیجہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نکاح کرنے کا خیال ہوا۔ نکاح کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر ۲۸ سال کی اور حضرت خدیجہؓ کی ۴۰ سال کی تھی۔

بعد نکاح کے ان سے چار لڑکیاں زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہ زہرؑ پیدا ہوئیں اور لڑکوں کی تعداد میں اختلاف ہے گر اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ کل لڑکوں نے صغر سنی میں وفات پائی اور حضرت خدیجہؓ نے ۳ قبل ہجری میں جب کہ پینسٹھ سال کی عمر تھی مکہ میں انتقال کیا۔

اس بات میں سب کو اتفاق ہے کہ جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دوسری عورت سے حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں نکاح نہ کرنے کا کوئی سبب ہو مگر یہ بات کہ اس وقت تک موافق رسم عیسائی مذہب کے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم دوسرا نکاح کر سکتے تھے محض غلط ہے اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ورقہ بن نوفل شام میں جا کر بذات خود عیسائی ہو گیا تھا۔ مگر یہ بات کہ خویلد حضرت خدیجہؓ کا باپ اور حضرت خدیجہؓ اور ان کے خاندان کے اور لوگ بھی عیسائی ہو گئے تھے کسی روایت سے ثابت نہیں ہے۔ معہذا انجیلوں سے جو اس وقت موجود ہیں تعدد ازواج کا امتناع کسی طرح پایا نہیں جاتا۔ پس یہ کہنا کہ مذہب عیسوی کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم دوسری شادی نہیں کر سکتے تھے محض غلط ہے۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا۔ حضرت سودہؓ کے باپ کا نام زمعہ اور ماں کا نام سموس بنت قیس تھا۔ ان کا پہلا نکاح سکران بن عمرو سے ہوا تھا اور اس سے ایک لڑکا عبدالرحمٰن پیدا ہوا۔ حضرت سودہؓ اور ان کا شوہر سکران بن عمرو دونوں مسلمان ہو گئے تھے اور جب کہ دوسری دفعہ مسلمان ہجرت کر کے حبش کو چلے گئے تھے حضرت سودہؓ بھی مع اپنے شوہر کے مکہ سے حبش کو ہجرت کر گئی تھیں جب وہ حبش سے واپس آئیں تو مکہ میں ان کا شوہر کا انتقال ہو گیا۔ پھر ۳ قبل ہجری میں جب کہ حضرت خدیجہؓ انتقال کر چکی تھیں حضرت سودہؓ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ہوا اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر (۵۰) سال کی تھی۔ مگر حضرت سودہؓ کی عمر اس وقت کیا تھی کسی کتاب سے معلوم نہیں ہوتی۔ بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ان کی وفات ۲۳ ہجری میں ہوئی۔

یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت سودہؓ سے کسی خواہش نفسانی کے سبب سے نکاح کیا ہو جیسا کہ معترضین کہتے ہیں۔ بلکہ حضرت سودہؓ قدیم الایمان تھیں اور کفار مکہ سے تکلیفیں اٹھائی تھیں اور حبشہ کی ہجرت پر مجبور ہوئی تھیں آخر الامر جب واپس آئیں تو ان کے شوہر نے انتقال کیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ان کو زوجیت میں لانا مقتضائے انسانیت اور تفقدان کے حال پر تھا' نہ مقتضائے خواہش نفسانی۔

سودہؓ بہت بڑھیا اور از کار رفتہ ہو گئی تھیں ان کو خوف ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان کو طلاق نہ دیدیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہا کہ آپ مجھ کو اپنی زوجیت میں رہنے دیں جو حقوق میری زوجیت کے ہیں وہ میں حضرت عائشہؓ کو دیدیتی ہوں۔

سورہ نساء میں جو یہ آیت ہے وان امراۃ خافت من بعلہا نشوزا او اعراضا فلا جناح علیہما ان یصلحا بینہما صلحا والصلح خیر یعنی اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے علیحدگی اور بے پروائی کا اندیشہ ہو تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ وہ آپس میں صلح کر لیں اور صلح بہتر ہے۔

اس آیت کو بعض راوی کہتے ہیں کہ حضرت سودہؓ کی شان میں اتری ہے۔ جب کہ ان کو خوف ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان کو طلاق دیدیں گے اور بعض راوی

کہتے ہیں کہ یہ آیت کسی خاص واقع پر نازل نہیں ہوئی۔ بلکہ بطور عام احکام کے نازل ہوئی ہے لیکن حضرت سودہؓ نے بموجب اسی آیت کے کہہ دیا تھا کہ میں اپنا حق زوجیت حضرت عائشہ کو دے دیتی ہوں۔ بہرحال یہ آیت خواہ حضرت سودہؓ کی شان میں اتری ہو یا بطور حکم عام کے ہماری رائے میں کچھ زیادہ بحث کے لائق نہیں ہے۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا۔ حضرت حفصہؓ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں۔ ان کی ماں کا نام زینب بنت مظعون تھا۔ جنہوں نے بعد اسلام قبول کرنے کے ہجرت کی تھی۔ حضرت حفصہؓ کے پہلے شوہر کا نام خنیس ابن حذافہ تھا۔ جنہوں نے حضرت حفصہؓ کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ اور جن کا انتقال بعد غزوہ بدر کے ہوا۔

خنیس کے انتقال کے بعد ان کا نکاح ۳ ہجری میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۱ سال کی تھی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر ۵۶ سال کی تھی۔ ان کا انتقال ۴۵ ہجری میں بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوا اور اس وقت ان کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ۱۸ قبل ہجری میں ہوئی تھی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کو طلاق رجعی دیدی تھی۔ مگر ہمارے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طلاق دینا ثابت نہیں ہے۔ اس کا ذکر سوائے ابن ماجہ کے غالباً اور کسی حدیث کی معتبر کتاب میں نہیں ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ابن ماجہ کی جو حدیث ہے اس میں سلمہ بن کیل ایک شیعہ مذہب کا راوی ہے جس کی روایت حضرت عمرؓ کی بیٹی کی نسبت اعتماد کے لائق نہیں ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جس روایت میں حضرت حفصہؓ کا طلاق دینا بیان ہوا ہے اس میں راوی کو غلطی ہوئی ہے۔ اسی لئے کہ عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنی جورو کو طلاق دی تھی اور حضرت عمرؓ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس مسئلہ کی نسبت پوچھا تھا۔ اس سبب سے راوی کو شبہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ کو طلاق دیدی ہے۔ غرضیکہ آنحضرتؐ کا حضرت حفصہؓ کو طلاق دینا ثابت نہیں ہے باقی رہی یہ بات کہ حضرت حفصہؓ نے کوئی بھید آنحضرتؐ کا کھول دیا تھا۔ اس کی نسبت جو کچھ ہم کو کہنا ہے وہ ماریہ قبطیہ کے حال میں بیان کریں گے۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا۔ حضرت ام حبیبہؓ کا اصلی نام رملہ تھا۔ ان کے باپ کا

نام ابوسفیان اور ماں کا نام صفیہ تھا۔ ماں اور باپ دونوں طرف سے وہ خاندان بنی امیہ سے تھیں۔ ان کا پہلا شوہر عبیداللہ بن جحش تھا۔ جو پہلے مسلمان ہو گیا تھا۔ اور جب ملک حبش کو دوسری بار لوگ ہجرت کرنے لگے۔ تو وہ بھی اپنی بیٹی ام حبیبہؓ کے ساتھ ملک حبش کو چلا گیا تھا۔ وہاں جا کر عبیداللہ تو عیسائی ہو گیا۔ مگر حضرت ام حبیبہؓ مذہب اسلام پر قائم رہیں۔ جب عبیداللہ مر گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نجاشی کو بطور ولی کے قرار دے کر کہلا بھیجا کہ ان کا نکاح ام حبیبہؓ سے کر دے۔ چنانچہ ۷ ہجری میں بمقام حبش ام حبیبہؓ کا نکاح ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے نجاشی نے مہر ادا کیا۔ اس وقت ام حبیبہؓ کی عمر ۲۷ سال کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر ۶۰ سال کی تھی۔ بعد نکاح کے حضرت ام حبیبہؓ ملک حبش سے آئیں اور آنحضرتؐ کے پاس رہیں بعد وفات رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ان کی وفات ۴۴ ہجری میں ہوئی۔ جب کہ ان کی عمر ۶۷ سال کی ہو چکی تھی۔ ان کی نسبت کوئی نکتہ چینی قابل التفات نہیں ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا۔ حضرت ام سلمہؓ جن کا اصلی نام ہند تھا۔ ان کی ماں کا نام عاتکہ ہے جو قبیلہ بنو کنانہ میں سے تھیں۔ مگر یہ عاتکہ عبدالمطلب کی بیٹی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پھوپھی نہیں تھیں۔ بلکہ ان کے باپ کا نام عامر تھا۔ حضرت ام سلمہؓ کے باپ ابو امیہ تھے جن کا نام حذیفہ تھا اور عرب کے مشہور فیاض اور شہسوار لوگوں میں خیال کئے جاتے تھے۔

حضرت ام سلمہؓ کے پہلے شوہر ابو سلمہ بن عبدالاسد مخزومی تھے وہ اور ان کے شوہر دونوں مسلمان ہو کر ملک حبش کو ہجرت کر گئے تھے۔ وہاں ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کا نام زینب تھا۔ اس کے بعد ایک اور لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام درہ تھا اور دو لڑکے سلمہ اور عمر بھی اسی نکاح سے پیدا ہوئے تھے۔

ابو سلمہ جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے جب انہوں نے ۴ ہجری میں وفات پائی تو حضرت ام سلمہؓ کا نکاح رسول خداؐ سے ہوا اس وقت اس کی عمر ۲۶ سال کی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر ۵۷ سال کی تھی۔ انہوں نے ۶۲ ہجری میں بعد وفات آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وفات پائی۔ اور ان کی عمر ۸۴ سال کی ہوئی۔ اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ۲۲ قبل ہجری میں ہوئی تھی۔ حضرت ام سلمہ کی نسبت کوئی نکتہ چینی

قابل توجہ نہیں ہے۔

حضرت زینب ام المساکین رضی اللہ عنہا۔ حضرت زینبؓ جو بسبب اپنی فیاضی کے ایام جاہلیت میں ام المساکین کے لقب سے مشہور تھیں قبیلہ بنو ہلال سے ہیں۔ ان کے باپ کا نام خزیمہ بن حرث اور ماں کا نام ہند بنت عوف تھا۔ ان کا پہلا شوہر عبداللہ بن جحش تھا۔ جس کے مرنے کے بعد ان کا نکاح ۳ ہجری میں رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۹ سال کی تھی۔ اور رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر ۵۶ سال کی۔ مگر وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس صرف آٹھ مہینے رہکر آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی کی زندگی میں ۴ ہجری میں انتقال کر گئیں ان کی عمر اس وقت ۳۰ سال کی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ۲۶ قبل ہجری میں ہوئی تھی۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت زینب ام المساکین نے اپنا نفس آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہبہ کر دیا تھا۔ مگر وہ روایتیں کسی طرح قابل اعتبار نہیں ہیں۔ کیونکہ جن ازواج مطہرات کا آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نکاح ہوا۔ اور ان کا مہر ادا کیا گیا۔ ان میں یہ بھی داخل ہیں۔ اور اس امر پر محدثین کا اتفاق ہے۔

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا۔ زینبؓ جحش کی بیٹی تھیں اور ان کی ماں کا نام امیمہ تھا۔ اور امیمہ عبدالمطلب کی بیٹی اور عبداللہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے والد کی بہن تھیں۔ ان کی عمر پچاس برس کی ہوئی اور ۲۰ ہجری میں انہوں نے وفات پائی اس حساب سے ان کی ولادت ۳۰ قبل ہجری میں ہوتی ہے۔

پہلی دفعہ ان کا نکاح زید بن حارثہ سے ۳ ہجری کے آخر یا ۴ ہجری کے شروع میں ہوا۔ جب زید نے ان کو طلاق دی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ۵ ہجری میں ان سے نکاح کیا اس وقت ان کی عمر ۳۵ سال کی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر ۵۸ برس کی تھی چھ برس یعنی وقت وفات آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم تک آپ کی زوجیت میں رہیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے بعد انتقال کیا۔

ان کے پہلے شوہر زید کے باپ کا نام حارثہ اور ان کے دادا کا نام شراحیل اور ان کی ماں کا نام سعدی بنت ثعلبہ تھا جو بنی معن قبیلہ بنی طے سے تھیں۔ ایام جاہلیت میں سعدی ان کی ماں ان کو لیکر کہیں جاتی تھی بنو قین نے رستہ میں ان پر حملہ کیا اور زید کو پکڑ کر عکاظ کے

بازار میں بیچنے کو لائے۔ اس وقت زید کی عمر آٹھ برس کی تھی حکیم بن حزام نے اپنی پھوپھی خدیجہ بنت خویلد کے لئے جو سب سے پہلی آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زوجہ تھیں۔ چار سو درہم پر خرید لیا۔ حضرت خدیجہ نے زید کو آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دیدیا اور آنحضرتؐ نے ان کو آزاد کر دیا۔

اتفاقاً زید کا باپ اور چچا مکہ میں آئے اور زید کو دیکھ کر پہچان لیا۔ اور یہ بات چاہی کہ زید کا فدیہ دیکر ان کو اپنے ساتھ لیجاویں مگر زید نے آنحضرتؐ کی خدمت میں رہنا پسند کیا۔ اس وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عرب کی رسم کے موافق زید کو اپنا متبنےٰ یعنی منہ بولا بیٹا کر لیا۔

بعد اس کے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے زید کا نکاح ام ایمن سے جنکی گود میں آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنا بچپن بسر کیا تھا۔ اور ان سے اسامہ پیدا ہوئے۔ ام ایمن کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بڑے اصرار سے زید کا نکاح زینب بنت جحش سے کر دیا۔

زینب ایک عالی خاندان کی عورت تھی ان کو یہ پسند نہیں تھا کہ ایک شخص جو درحقیقت غلام ہے گو آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کو آزاد کر کے متبنےٰ کر لیا ہے اس سے نکاح کریں۔ لیکن جب آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نکاح کرنے پر اصرار کیا اور اس پر ایک آیت بھی نازل ہوئی کہ کسی مسلمان مرد اور عورت کو یہ نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول نے کوئی بات مقرر کر دی ہو۔ تو پھر اس امر میں ان کو اختیار رہے اور جس نے خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی ایک بڑی گمراہی میں مبتلا ہوا۔ چنانچہ وہ آیت یہ ہے۔ وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبینا۔ تو اس وقت زینب زید سے نکاح کرنے پر راضی ہو گئیں۔ پس یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ خود رسول اللہ صلے علیہ و آلہ وسلم کے اصرار سے زینب نے زید سے نکاح کرنا قبول کیا تھا۔ اگر خود رسول صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو زینب سے نکاح کرنا منظور ہوتا تو اس قدر اصرار زید کے ساتھ نکاح کرنے میں کیوں فرماتے۔

بعد نکاح کے زینب اور زید میں موافقت نہیں ہوئی۔ زینب اپنے شوہر کو نہایت حقیر سمجھتی تھی اور اس سے بدزبانی کرتی تھیں اور جو کچھ وہ کہتا تھا اس کو نہیں مانتی تھی اور ایسا

ہونا کوئی عجیب بات نہ تھی کیونکہ جو حالت زید کی تھی اور جو حالت زینب کی تھی وہ اس بات کی مقتضی تھی کہ زینب ضرور اپنے شوہر کو حقیر اور بے وقعت سمجھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زید زینب کی باتوں سے تنگ ہو گیا اور طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ اور جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ نے زید کو سمجھایا اور طلاق دینے سے منع کیا۔ چنانچہ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ۔ یعنی خدا نے پیغمبر کو یاد دلایا کہ جب تو زید سے جس پر خدا نے احسان کیا اور جس پر تو نے احسان کیا۔ کہتا تھا کہ اپنی جورو کو اپنے پاس رہنے دے اور خدا سے ڈر اور چھپاتا تھا اپنے دل میں اس بات کو جس کو خدا ظاہر کرنے والا ہے اور ڈرتا تھا لوگوں سے اور خدا بہت لائق ہے کہ اس سے ڈرے۔

مخالفین اسلام کہتے ہیں کہ اس آیت میں امسک کا لفظ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف دنیاداری کے طور پر بیان کیا تھا۔ مگر ان کے دل میں یہ بات تھی کہ کسی طرح زید طلاق دیدے تو آپ اس سے نکاح کر لیں۔ مگر ہم کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ کس طرح ان لوگوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں یہ تھا کہ زید اپنی بیوی کو طلاق دے مگر ظاہرداری سے کہا کہ امسک علیک زوجک پس یہ ایک جھوٹا اتہام ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لگایا گیا ہے۔

اس آیت میں جو یہ لفظ ہیں وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ اس کی خدا نے کچھ تشریح نہیں کی آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا اپنے دل میں چھپا رکھا تھا۔ اس پر مفسرین اور اہل سیر میں سے کسی نے کسی امر کا چھپانا اور کسی نے کسی امر کا چھپانا بیان کیا اور وہ متعدد اقوال ایک نے دوسرے سے روایت کئے اور وہی متعدد روایتیں کتب تفاسیر اور سیر میں مندرج ہوئیں جو محض ایک شخص کی رائے ہونے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ ان میں ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے مخالفین اسلام نے سند پکڑی ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نکتہ چینی کی ہے۔ مگر ایسی روایتوں سے جو محض بے اصل ہیں اور راویوں کی رائے ہونے کے سوائے اور کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نکتہ چینی نہیں ہو سکتی۔ ہاں بلاشبہ ان راویوں سے قطع نظر کر کے قرآن مجید کے الفاظ اور سیاق پر غور کرنا چاہئے اور جو امر کہ از روئے عقل انسانی بلا لحاظ معتقدات مذہبی قرار پائے اس کو تسلیم کرنا چاہئے۔ اگر اس وقت

کوئی امر نکتہ چینی کے قابل ہو تو اس پر نکتہ چینی کی جاوے۔ مگر اس امر کو کہ فلاں مفسر نے یہ کہا ہے اور فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پر بنیاد نکتہ چینی قرار دینا تو محض لغو اور ناواجب ہے۔

اس اخفا کی نسبت بعض لوگوں نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خبر کردی تھی کہ زید زینب کو طلاق دیگا۔ اور زینب تیری زوجیت میں آئے گی۔ مگر جب زید نے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ذکر کیا کہ میں زینب کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسکو طلاق دینے سے منع کیا۔ حالانکہ ان کو خدا نے اطلاع کردی تھی کہ زید زینب کو طلاق دیگا اور وہ تیری زوجیت میں آئے گی۔ پس اسی بات کو آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دل میں چھپایا اور اسی کی نسبت و تخفی فی نفسک میں اشارہ ہے۔

اسی امر کو اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا ہے مگر ان مفسروں کا اس بات کو تسلیم کرنا کہ خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو وحی سے مطلع کردیا تھا کہ زید زینب کو طلاق دیگا اور زینب تیری زوجیت میں آئیگی اور تخفی فی نفسک سے اسی کا اخفا مراد لینا محض بے اصل ہے اور قرآن مجید یا قرینہ مقام سے یہ امر نہیں نکلتا اور نہ کبھی پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بیان کیا کہ اس باب میں مجھ کو وحی ہوئی ہے پس یہ ایک غلطی اس شخص کی ہے جس نے اول اپنی رائے سے تخفی کا یہ مطلب قرار دیا اور کتب تفاسیر اور سیر میں بطور روایت کے مندرج ہوا ہے

بعض لوگوں نے کہا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اتفاقاً زینب کو سر ننگی یا نہاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اس پر فریفتہ ہو گئے تھے اور تخفی فی نفسک سے اسی فریفتگی کی طرف اشارہ ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ چند حقیقی امر اور واقعی حالات بیان کریں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ جو مراد تخفی فی نفسک سے اوپر بیان ہوئی ہے وہ کسی طرح بھی صحیح ہو سکتی ہے یا نہیں؟ زینب بیٹی تھی جحش کی اور ان کی ماں کا نام امیمہ تھا اور امیمہ بیٹی تھی عبد المطلب کی اور بہن تھیں عبداللہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے والد کی۔ پس زینبؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو پھوپھی کی بیٹی تھیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ابتدائی عمر سے زینب سے

بخوبی واقف تھے اور ہزاروں دفعہ اسے دیکھ چکے تھے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی زینب کا زید سے نکاح کرنے کا باعث ہوئے تھے پس آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دفعۃً ان کو دیکھنا اور ان پر فریفتہ ہو جانا کیسی لغو اور مہمل بات ہے کوئی ذی عقل تو اس کو قبول نہیں کر سکتا اس سے ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا بیان کیسا لغو اور ناواجب ہے اور گو کہ کسی تفسیر اور سیر کی کتاب میں لکھا ہو ہرگز قابل قبول نہیں ہے اور یہ روایت کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم زینبؓ کو ننگا دیکھ کر فریفتہ ہو گئے تھے محض جھوٹی اور غلط ہے اور کسی حدیث کی معتبر کتاب میں نہیں ہے۔

ان تمام واقعات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زیدؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے زینبؓ کے طلاق دینے کا ذکر کیا اور باوصف سمجھانے کے زیدؓ نے نہ مانا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ضرور اس بات کی فکر ہوئی کہ زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد زینبؓ کا کیا حال ہو گا اور اس وجہ سے ضرور آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ اگر زیدؓ طلاق دیدے تو بجز اس کے اور کچھ علاج نہیں کہ آپ خود اس سے نکاح کر لیں کیونکہ اول تو خود آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم زینب کا زید سے جو غلام تھا نکاح کرنے کا باعث ہوئے تھے۔ اور زید کے طلاق دینے کے بعد کوئی شخص زینب کو اس وجہ سے کہ وہ ایک غلام کی جورو تھیں اس عزت اور وقار سے نہیں رکھ سکتا تھا جس عزت اور وقار سے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو رکھنا چاہتے تھے۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو لوگوں کا ڈر تھا کہ عرب میں متبنٰے کی جورو سے نکاح کرنا معیوب تھا۔ پس اسی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے۔ تخفی فے نفسک ما اللہ مبدیہ یعنی جس بات کو تو دل میں چھپاتا تھا۔ خدا اس کو ظاہر کرنے والا تھا۔ اور پھر فرمایا تخشی الناس و اللہ احق ان تخشاہ یعنی تو لوگوں سے ڈرتا تھا حالانکہ خدا ہی سے ڈرنا چاہئے تھا۔

بعد اس کے زید نے زینب کو طلاق دی اور عدت کے دن گذر گئے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے زینب سے نکاح کیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ فلما قضی زید منھا وطرا زوجنٰکھا لکی لا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیا ئھم اذا قضوا منھن وطرا و کان امر اللہ مفعولا۔ یعنی جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی یعنی اس کو طلاق دیدی اور عدت بھی پوری ہو گئی تو ہم نے اس کو تیری زوجیت میں دیا تاکہ مسلمانوں کو اپنے لے پالک بیٹوں

کی جوروؤں کے ساتھ نکاح کرنے میں کچھ تردد نہ ہو- جب کہ وہ بیبیاں عدت کے دن پورے کرلیں اور خدا کا حکم تو شدنی ہے- عدت کے دن گذرنے کے بعد نکاح کرنا آیت مذکورہ کے الفاظ- " قضی زید منھا وطرا" - سے ثابت ہوتا ہے اس آیت میں جو لفظ زوجنا کہا ہے- اس پر لوگوں نے قیاس دوڑایا کہ نکاح کی نسبت جو خدا نے اپنے ساتھ کی ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ خود خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا زینب کے ساتھ نکاح کردیا اور جب کہ خدا آسمانوں پر رہتا ہے تو وہ نکاح آسمانوں پر خدا نے کیا ہوگا- اور خدا اور جبرائیل اس کے گواہ ہوئے ہونگے- اس قیاس پر اور بہت سی غلط اور جھوٹی باتیں زیادہ ہوتی گئیں اور ان کو ایک نے دوسرے سے روایت کیا اور بطور ایک روایت کی کتب تفاسیر و سیر میں مندرج ہوئیں اور مخالفین مذہب اسلام نے ان کو بنیاد نکتہ چینی قرار دیکر آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نکتہ چینی شروع کی- مگر جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ایسی مہمل روائیتں آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نکتہ چینی کی بنیاد نہیں ہوسکتیں-

تمام روایتوں میں مندرج ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس نکاح کا ولیمہ نہایت عمدہ طور سے دیا تھا اور یہ دلیل اس بات کی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حسب دستور بعد طلاق زید کے زینب سے نکاح کیا تھا- پس جن لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بغیر نکاح کے زینب سے مقاربت کی تھی وہ سراسر غلط فہمی پر ہیں اور غالباً یہ خیال ان کے دل میں لفظ زوجنا کہا سے پیدا ہوا ہے جس سے آسمانوں پر نکاح ہو جانے کا خیال سمجھا گیا تھا- مگر یہ دونوں خیال محض غلط ہیں اسی لئے کہ خدا تعالٰی نے ہزاروں جگہ قرآن مجید میں بندوں کے افعال کو بہ سبب علۃ العلل ہونے کے اپنی طرف منسوب کیا ہے اور اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ فعل بندوں نے نہیں کئے-

کسی کو متبنٰے کرلینے یعنی منہ بولا بیٹا بنا لینے سے درحقیقت وہ صلبی بیٹا نہیں ہو جاتا اور نہ متبنے کرلینے والا حقیقی باپ ہو جاتا ہے پس جو حکم کہ صلبی بیٹے کی زوجہ سے متعلق ہے وہ اس کی زوجہ سے متعلق نہیں ہوسکتا- یہ رسم جو خلاف واقعی حالت کے عرب جاہلیت میں جاری تھی اس کا معدوم کرنا نہایت مناسب اور ضروری تھا جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے- " لکیلا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیاءھم اذا قضوا منھن وطرا"- اور اس امر کے صاف طور پر ظاہر ہو جانے کیلئے خدا نے فرمایا- ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم

النبین - یعنی محمد تم مردوں سے کسی شخص کے باپ نہیں - مگر وہ خدا کے رسول اور انبیا کے خاتم ہیں یعنی ان کے بعد اور کوئی نبی نہیں ہونے کا۔

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ متبنے کو اس کا بیٹا کہہ کر پکارتے تھے جس نے اس کو متبنے کیا ہو اور اس سے شبہ پڑتا تھا کہ وہ اس کا صلبی بیٹا ہے اس بات کو آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے منع کر دیا کہ جو درحقیقت کسی کا صلبی بیٹا نہیں ہے اس کو اس کا بیٹا کہہ کر مت پکارو - بلکہ اس کا بیٹا کہہ کر پکارو جس کا وہ درحقیقت صلبی بیٹا ہے اور جس آیت میں حکم ہے وہ یہ ہے - وما جعل ادعیاء کم ابناء کم ذلکم قو لکم بافواھکم واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ادعو ھم لاباء ھم ھو اقسط عند اللہ فان لم تعلموا اٰباء ھم فاخوا نکم فی الدین وموا لیکم یعنی خدا نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا صلبی بیٹا نہیں بنایا یہ تمہارا کہنا ہی کہنا ہے اور خدا اچی بات کہتا ہے اور وہ سیدھا راستہ بتاتا ہے - ان کو ان کے باپوں کے نام سے پکارو - خدا کے نزدیک یہی بہت ٹھیک ہے پھر اگر تم ان کے باپوں کو نہیں جانتے تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے موالی ہیں -

اگر یہ کہا جائے کہ منہ بولا بیٹا کہنے سے وہ بمنزلہ صلبی بیٹے کے نہیں ہو جاتا اور اسی لئے اس کی زوجہ سے جب وہ اس کو طلاق دیدے نکاح جائز ہے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ازواج سے جو وہ بھی بمنزلہ منہ بولی ماں کے ہیں کیوں نکاح حرام ہوا - مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بہ سبب اس کے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ازواج کو ماں کہا گیا ہے ان سے نکاح جائز نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ازواج کو محرمات میں داخل کر دیا ہے اور جس کی وجہ اصلی ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور بہ سبب ان کے محرمات میں داخل ہونے کے ان پر امہات کا لفظ بولا گیا ہے نہ یہ کہ امہات کہنے سے وہ حرام ہو گئیں ہیں - پس امہات کہنے سے اور ان سے نکاح حرام ہونے سے کچھ تعلق نہیں ہے - اس لئے کہ وہ محرمات میں تھیں اس لئے امہات کا لفظ بولا گیا ہے -

ولادت مسیح کے متعلق

ایک چٹھی اور اس کا جواب

لاہور نمبر ۵۲۱ مورخہ ۔ ۱۹ جولائی ۱۸۹۸ء

جناب منشی صاحب خدا آپ کی عمر میں برکت دے!

کچھ عرصہ ہوا ہے کہ میں نے سید السادات اعنی سر سیّد احمد خان علیہ الرحمتہ والغفران کی خدمت بابرکت میں جن کی وفات سے وہ صدمہ ہوا ہے جس کا بیان قلم اور زبان سے ہونا مشکل ہے ایک خط روانہ کیا تھا ۔ اس کا جواب انہوں نے پشت خط پر لکھ بھیجا تھا ۔

ایک مقدس مقولہ ہے کہ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا فَاَکْثَرَ ذِکْرَہٗ ' جس کو کوئی چیز پیاری لگتی ہے ۔ وہ اکثر اس کا ذکر کرتا رہتا ہے ۔ اسی بناء پر میں اس خط کو مع جواب کے ذیل میں نقل کر کے مترصد ہوں کہ آپ اسے اخبار "چودھویں صدی" میں چھاپ کر نہ صرف میرا بلکہ ان سب اصحاب کا جو سید مرحوم و مغفور کے طریق استدلال کو پسند رکھتے اور ان کی قرآنی تفسیر کی میری طرح نہایت دل و جان سے قدر و منزلت کرتے ہیں ۔ شکر گذاری کا موقع حاصل کرینگے ۔

والسلام

وھو ھذا

بارود خانہ ۔ لاہور نمبر ۴۹۸ مورخہ ۲۹ جنوری ۱۸۹۸ء

حکیم امت سلمہٗ ربہٗ!

حضرت عیسیٰ اور یحییٰ کی پیدائش کا ذکر قرآن شریف میں باہم بیان ہوتا ہے ۔ چنانچہ سورۃ آل عمران اور مریم کے دیکھنے سے یہ امر بخوبی واضح ہے اور لطف یہ ہے کہ الفاظ بھی یحییٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) کی بشارت و پیدائش کے بیان میں مماثل و مشابہ ہیں ۔ میں یہاں ان آیات کو جن میں زکریا اور مریم کی بشارتوں اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر ہے بالمقابل لکھتا ہوں ۔

زکریاؑ کو بشارتیں

فنادتہ الملکت وھو قائمۃ یصلی فی المحراب ان اللہ یبشرک بیحیی مصدقا بکلمۃ من اللہ وسیدا و حصورا ونبیا من الصالحین قال رب انی یکون لی غلام وقد بلغنی الکبر وامراتی عاقر۔ قال کذالک اللہ یفعل مایشاء۔ (آل عمران)

کھیعص ۔ ذکر رحمۃ ربک عبدہ زکریا ۔ اذنادی ربہ نداء خفیا ۔ قال رب انی یکون لی غلام و کانت امرتی عاقرا وقد بلغت من الکبر عتیا قَالَ کذٰلک قال ربک ھو علی ھینّ وقد خلقتک من قبل ولم تک شیئا (سورۃ مریم)

مریم کو بشارتیں

واذ قالتہ الملئکت یا مریم ان اللہ اصطفٰک وطھرک واصطفٰک علی نساء العالمین یا مریم اقنتی لربک واسجدی وارکعی مع الراکعین ۔ اذ قالت الملئکت یا مریم ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ اسمہ المسیح عیسیٰ ابن مریم وجیھًا فی الدّنیا والاٰخرۃ ومن المقربین ۔ و یکلّمُ النّاس فے المھدِو کھلاً و منَ الصّالحِین ۔ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُونُ لِی وَلَدٌ وَلَم یَمْسَسنِی بَشَرٌ قَالَ کَذٰلِکِ اللہُ یَخْلُقُ مَا یَشَاءُ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُولُ لَہٗ کُنْ فَیَکُون ۔ (آل عمران)

فارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشرا سویا قالت انی آعوذ بالرحمن ان کنت تقیا ۔ قالت انی یکون لی غلامٌ و لم یمسسنی بشر ولم اک بغیا ۔ قال کذلک قال ربک ھو علی ھین ولنجعلہ اٰیتہ للناس ورحمتہ منا وکان امرا مقضیا ۔ (سورۃ مریم)

یحییٰ کو خدا کہتا ہے

یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ واٰتینہ الحکم صبیا ۔ وحنانا من لدنا وزکوۃ ۔ وکان تقیا ۔ وبرا بوالدیہ ولم یکن جبارا عصیا ۔ وسلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیا ۔ (مریم)

عیسےٰ خود کہتا ہے

ان عبداللہ اتنی الکتاب و جعلنی نبیا۔ و جعلنی مبارکا این ما کنت واوصنی بالصلوۃ والزکوۃ مادمت حیا۔ وبرا بوالدتی ولم یجعلنی جبارا شقیا۔ وسلم علی یوم ولدت و یوم اموت ویوما بعث حیا۔ (مریم)

مخطّ سطور میں سے غور کرنے کے قابل دو مقام ہیں یحییٰ کے لئے۔ کذلک اللہ یفعل مایشاء عیسے کی نسبت کذلک اللہ یخلق مایشاء۔ فعل اور خلق میں ضرور فرق ہے۔ قطع نظر اس کے یحییٰ کی نسبت الفاظ ہیں برابوالدیہ اور حضرت عیسےٰ کہتے ہیں برابوالدتی۔ اس اعتراض کا جواب کیا ہو گا کہ اگر ان کا باپ ہوتا تو والدہ کو متفرو نہ کرتے۔ اور کہتے برابوالدی۔

میں نے بہت دفعہ تفسیر القرآن کو غور سے پڑا۔ ان الفاظ پر اس میں بحث نہیں پائی۔ باقی آیتیں تو بے شک صاف ہیں۔ لیکن اس کا جواب بالضرور آپ کے ذمہ ہے۔

کئی برس گذرے ہیں یہی سوال میں نے ایک لائق اور صاحب تصانیف شخص سے کیا تھا اور سوائے سکوت کے ان سے کچھ بن نہ پڑا۔ ایسے ہی اور کئی مقام ہیں جہاں میرا فہم اور ادراک عاجز ہے اور آپ سے سمجھنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی سچ ہے کہ جناب کو نہایت ہی ضروری کام اور بہت سے سرانجام کرنے ہوتے ہیں۔ مگر میں بھی فہم قرآن کے واسطے اس قدر بیتاب اور مشتاق ہوں کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔

آج کل لاہور میں ایک مولوی صاحب جو پنجاب کے ایک کونے کے متوطن ہیں بغرض چھپوانے تفسیر کے جس کو ساتھ ساتھ تالیف بھی کرتے جاتے ہیں آئے ہوئے ہیں۔ بہ نسبت احادیث کے جس طرح عام غیر مقلدین (یا جس لقب سے کہ یہ لوگ خوش ہوتے ہیں اور پہچانے جاتے ہیں عاملین بالحدیث) کا حال ہے یہ شخص بہت کچھ قرآن کی تعظیم کرتا اور قابل سند بتاتا ہے۔

میں ایک روز مع چند احباب کے اس کے دیکھنے کو گیا۔ اور بعض مقامات قرآن کی تفسیر پوچھی۔ جن میں سے ایک مقام یہ تھا۔ ولقد ھمت بہ وھم بھالولا ان لا برھان ربہ۔ (سورت یوسف) اس کے معنی مولوی صاحب نے مفسرین پر کلمات افسوس کہکر وہی کئے جو میں عہد

خروی سے سمجھے ہوا ہوں۔ (ذلک فضل اللہ علی) یا یہ کہ قریب قریب جیسا کہ جناب نے تفسیر کی ہے۔

زاں بعد ولادت مسیح پر گفتگو ہوئی۔ اس پر انہوں نے پرانا دقیانوسی خیال ظاہر کیا۔ غرض میں کل تو نہیں اگلے یکشنبہ کو ان کے پاس جاؤنگا۔ چونکہ مجھے خود بھی برابوالدیہ اور برابوالدتی دل میں کھٹکتا ہے۔ لہٰذا مصدع اوقات گرامی ہوں کہ اس کا جواب بہت جلد تحریر کریں۔

میرا خیال تھا اور شاید ٹھیک بھی تھا کہ بروقت تفسیر کرنے سورۃ مریم کے آپ ان الفاظ پر بحث کریں گے چونکہ تفسیر کا چھاپا جانا ملتوی کیا گیا ہے میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس آیت کی تفسیر فرما کر اجر حاصل کریں گے۔ والسلام

میں ہوں آپ کا تابعدار اخلاص شعار۔ احمد بابا مخدومی۔ کلرک دفتر لوکو سپرنٹنڈنٹ ریلوے لاہور۔

جواب

جناب مخدومی!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام لوگوں میں ابن مریم کر کے مشہور تھے۔ اسی شہرت کے اعتبار سے قرآن مجید میں بھی ان کو ابن مریم سے تعبیر کیا ہے۔ بہت لوگ اسی طرح اپنی ماں کے نام سے مشہور ہوئے ہیں۔ پس قرآن مجید میں جس طرح ابن مریم کہا گیا ہے بربوالدتی کہا ہے۔ اس لفظ سے یہ سمجھنا کہ ان کا کوئی باپ نہیں تھا۔ کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ کیا سادات کو جو بنی فاطمہ کر کے مشہور ہیں آپ بن باپ کا پیدا ہوا خیال فرماتے ہیں؟

والسلام خاکسار

(دستخط) سیّد احمد۔ علی گڑھ

مکاشفہ

گو ہم کو کشف و مکاشفہ نہ ہو مگر ہم کو سمجھنا تو چاہئے کہ یہ کیا چیز ہے؟ جاہل طب کو نہیں جانتا مگر یہ جانتا ہے کہ طب سے کیا ہوتا ہے اور کیونکر ہوتا ہے پس اگر ہم بھی کشف و مکاشفہ سے جاہل ہیں تو بھی ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ہے کیا چیز؟ حضرات صوفیہ کرام فرماتے ہیں کہ روح اور جسم میں جو حجاب ہے اس کے اٹھ جانے کو مکاشفہ کہتے ہیں مگر حجاب کے لفظ نے ہم کو گھبرا دیا کہ وہ پردہ کیسا ہے جو روح اور جسم کے بیچ میں ہے نہ وہ پردہ ٹاٹ کا ہو سکتا ہے نہ کپڑے کا نہ لنکاٹ۔ پھر وہ پردہ کاہے کا ہے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ غطاء کا لفظ آیا ہے جس کے معنی بھی حجاب کے ہیں۔ جہاں خدا نے فرمایا ہے "فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ" ہم نے جب تفسیروں کو دیکھا تو ان میں غطاء کے معنی غفلت کے لکھے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ جو پردہ انسان کے جسم اور روح کے درمیان میں ہے وہ غفلت کا پردہ ہے اور اس غفلت کا دور ہونا پردہ کا اٹھ جانا ہے پس انسان مشاغل دنیوی سے جو اس پر پردہ غفلت ڈال دیتے ہیں علیحدہ ہو کر مبد حقیقی یا ذات باری کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اپنے خیال کو اسی طرف لگالیتا ہے تو غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے پس مکاشفہ ایک حالت ہوئی جو خود انسان کے خیال میں پیدا ہوتی ہے پس جو کچھ کہ وہ اپنے نفس میں پاتا ہے اور فرض کرو کہ وہ اس حالت میں کچھ دیکھتا بھی ہے تو بجز اس کے خیال کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے اور اس لئے مکاشفہ کی حقیقت بجز اس کے جس کو کہ خود انسان نے اپنے خیال میں پکایا ہے اور کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی اور اسی حالت کو صوفیہ کرام نے مکاشفہ نظری سے تعبیر کیا ہے اور جب کہ اسی خیال کو اور زیادہ پکایا جاتا ہے اور اس کے تصور میں یہ خیال جم جاتا ہے کہ میرا دل بھی نورانی ہو گیا ہے تو اس حالت کو صوفیہ کرام کاشفہ نوری سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ بجز خیال انسانی کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

اور جب اس خیال کو اور زیادہ پکاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ تمام اسرار آفرینش پر اس کا ذہن محیط ہو گیا ہے تو اس کو صوفیہ کرام نے مکاشفہ سری سے یا مکاشفہ الٰہی سے تعبیر کیا ہے حالانکہ وہ بھی بجز ان کے خیال کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

اور جب کہ اس خیال کو دل میں اور زیادہ پکایا اور سمجھنے لگا کہ دوزخ اور بہشت کا حال

مجھ پر کھل گیا ہے اور فرشتے مجھ کو دکھائی دیتے ہیں اور بے انتہا عالم مجھ پر کھل گئے ہیں تو اس حالت کو صوفیہ کرام نے مکاشفہ روحانی سے تعبیر کیا ہے۔ مگر وہ بھی بجز خیال انسانی کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

اور جب کہ وہ اس خیال کو اور زیادہ پکاتا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ میں صفات باری میں بھی بیٹھ گیا ہوں تو صوفیہ کرام نے اس حالت کو مکاشفہ صفاتی سے تعبیر کیا ہے حالانکہ وہ بھی بجز اس کے خیال کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

اگر یہ عالت انسان کے خدا کی صفت علمی میں بیٹھ جانے سے پیدا ہوئی ہو تو اس کو علم لدنی حاصل ہوتا ہے اور اگر خدا میں جو صفت سننے کی ہے اس میں وہ بیٹھ گیا ہو تو وہ خدا کا کلام سن سکتا ہے جیسا کہ موسی علیہ السلام سنتے تھے۔ اور اگر وہ خدا کے بصیر ہونے کی صفت میں بیٹھ گیا ہے تو اس کو خدا کا دیدار ہونے لگتا ہے اور اگر وہ خدا کے جلال کی صفت میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کو بقا حقیقی حاصل ہوتی ہے اور اگر خدا کی صفت وحدانیت میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کو وحدت حاصل ہوتی ہے اسی طرح وہ خدا کی جس صفت میں بیٹھ جاتا ہے اسی کے موافق حالت اس پر طاری ہوتی ہے جس کو وہ مکاشفہ سمجھتا ہے مگر وہ بجز اس کے خیال کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔

اب صوفیہ کرام فرماتے ہیں کہ مکاشفہ ذاتی ایسی چیز ہے جس کا بیان کسی طرح نہیں ہو سکتا پس ان بیانات سے اس قدر سمجھ میں آتا ہے کہ انسان جو کچھ اپنے خیال میں پکا لیتا ہے اسی کا نام مکاشفہ ہے اور یہ حالتیں جو صوفیہ کرام نے بیان کی ہیں سب خیال ہی خیال ہیں اور خیال کے سوا کچھ نہیں۔ وللہ در من قال التصوف ھو ارجاع النفس الی امور خیالتہ والمداومتہ علیھا۔ الی زمان حتی تتخیل الامور بخیالہ کان ھذا الامور موجودۃ فی نفسہ لاکن الموجود فی خیالہ ھو خیالہ لاشئ غیرہ ھکذا ۔ترقی من خیال الی خیال اٰخرو ۔تصور شئ اخرو لکنہ لیس بشئ اخر۔ الا ھو خیال نفسہ فاذا ترقی ھذا الخیال الی شئ ۔تخیل انہ ھو اللہ لوشان من شیونہ والان ۔تخیل انہ رفع نفسہ الی اعلی الدرجتہ و عرف اللہ حق معرفتہ واللہ بری عن ھذا والحق انہ لیس کمثلہ شئ وھو السمیع البصیر۔

واقعات عامتہ الورود

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں جن کو اکثر ایک ہی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں مگر جو لوگ اہل اللہ کہلاتے ہیں وہ اور ان کے معتقدین اس کو کرشمہ ربانی سمجھتے ہیں اور جو لوگ اہل دنیا کہلاتے ہیں وہ ان کو واقعات اتفاقی سمجھ کر کچھ خیال نہیں کرتے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک اپنا واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص ان سے ملنے آیا اور اس وقت شاہ صاحب اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے حلوہ کھا رہے تھے شاہ صاحب کے خادم نے اس شخص کو بھی جو آیا تھا حلوہ دیا۔ اس شخص کے دل میں یہ بات آئی کہ اگر شاہ صاحب وہ حلوہ مجھ کو دے دیں جو ان کے ہاتھ میں ہے تو میں ضرور یقین کروں گا۔ کہ وہ اولیا اللہ میں سے ہیں۔ اور میں ان سے خدا کی راہ سیکھوں گا۔ شاہ صاحب کو بھی قرائن سے معلوم ہوا کہ اس شخص کے دل میں یہ بات گذری ہے ان کو اپنی ولایت کا اظہار منظور نہ ہوا اور جو خیال کہ اس شخص کے دل میں گذرا تھا اور جس کو انہوں نے بھی جان لیا تھا اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور جو حلوہ کہ ان کے ہاتھ میں تھا اس کو ایک لقمہ کر گئے۔

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ خدا نے مجھ سے مواخذہ کیا اور جو بے پروائی میں نے کی تھی وہ میرے منہ پر ماری میں نے اپنے اس فعل کی خدا سے معافی چاہی اور استغفار کی خدا نے مجھ کو معاف کر دیا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ جب شاہ صاحب نے قرائن سے اس شخص کے دل کی خواہش کو دریافت کر لیا تھا اور اس کو پورا نہ کیا تو آخر کو ان کے دل میں اس کا نہایت رنج و افسوس ہوا ہو گا جس کو اس سبب سے کہ وہ اہل اللہ تھے انہوں نے خدا کی طرف مواخذا سمجھا اور اس سے توبہ اور استغفار کی۔ اگر کوئی اہل دنیا میں سے ہوتا اور اس کو بھی ایسی حالت میں رنج ہوتا تو وہ اس کو خدا کے مواخذہ سے تعبیر نہ کرتا۔

ایک واقعہ ہم پر قریب قریب اس کے گذرا ہے میں جب دہلی سے رہتک جانے والا تھا۔ حضرت شاہ احمد سعید صاحب کی خدمت میں رخصت کے لئے حاضر ہوا۔ اس وقت ایک عورت ایک نہایت تر و تازہ رنگترہ لائی اور شاہ احمد سعید کی خدمت میں پیش کیا انہوں نے اس کو لے کر رکھ لیا۔ میرے دل میں یہ بات آئی کہ اگر شاہ صاحب یہ رنگترہ مجھ کو دے دیں تو

میرے سفر کے لئے ایک فال نیک ہو گی جب میں رخصت ہو کر جانے لگا تو شاہ صاحب نے وہ رنگترہ اٹھا کر مجھ کو دیا کہ آپ اس کو لیتے جایئے میں چونکہ ایک دنیا دار تھا اور گو شاہ صاحب کی خدمت میں مجھ کو عقیدت تھی اور ہے مگر اس کو ایک امر اتفاقی سمجھا اور جو لوگ کہ مریدان خاص حضرت شاہ صاحب کے تھے انہوں نے اس امر کو خطرات قلب پر بطور مکاشفہ کے مطلع ہونا قرار دیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب اپنا دوسرا واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک باوجاہت آدمی ان سے ملنے کو آیا۔ اور وہ ایسا وقت تھا کہ شاہ صاحب کو مناسب تھا کہ اس کو کھانے کے لئے اور اس کو رات کو اپنے ہاں ٹھہرنے کے لئے کہتے اور وہ شخص بھی یہی سمجھتا تھا کہ میں ان کے ہاں کھاؤں گا اور انہیں کے ہاں رات کو رہوں گا شاہ صاحب کو یہ بھی خیال ہوا کہ اگر میں اس کو کھانا نہ کھلاؤں اور رات کو رہنے کو نہ کہوں تو اس کی نہایت دل شکنی ہو گی۔ مگر انہوں نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی نہ اس کو کھانا کھلایا نہ رہنے کے لئے کہا جب وہ اٹھ کر چلا گیا تو شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ مجھ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے خفگی ہوئی اور کہا گیا کہ یہ ایک نادانی کا کام تھا۔

شاہ صاحب کو بلاشبہ اس بات کا رنج ہوا ہو گا کہ اس کو کیوں نہ کھانا کھلایا اور کیوں نہیں رات کو رکھا۔ مگر اس رنج کو چونکہ وہ اہل اللہ تھے خدا کے عتاب سے منسوب کیا اگر کوئی دنیا دار ہوتا تو اس کا کچھ بھی خیال نہ کرتا۔

مثل اس کے ایک واقع ہم پر بھی گذرا ہے بنارس میں ایک نہایت مقدس اور بزرگ شخص مجھ سے ملنے کو آئے جب کہ میں انگلستان سے واپس آیا تھا اور ان بزرگ کا ارادہ تھا کہ میرے ہاں رات کو رہیں مگر کھانا دوسری جگہ کھائیں۔ مجھ کو یہ امر پسند نہ آیا اور میں نے کہا کہ جہاں آپ کھانا کھائیں گے وہیں رات کو بھی رہیں۔ وہ بزرگ تھوڑی دیر مل کر چلے گئے ان کے جانے کے بعد مجھ کو نہایت رنج و افسوس ہوا کہ میں نے یہ بات نہایت خلاف آدمیت اور خلاف مروت اور خلاف اخلاق کی مگر چونکہ میں دنیا دار تھا اس لئے میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ خدا نے مجھ سے مواخذہ کیا ہے۔

پس یہ عام واقعات ہیں جو کم و بیش ہر ایک کو پیش آتے ہیں اہل اللہ ان کو خدا کی

طرف منسوب کرتے ہیں اور اہل دنیا ان کو اتفاقی بات سمجھ کر ٹال دیتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے۔

کار پاکاں راقیاس از خود گیر
گرچہ ماندور نوشتن شیر و شیر

خلافت

رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں تین صفتیں جمع تھیں۔
اول نبوت۔ یعنی شریعت کے احکام کا خدا کی طرف سے آپ کے پاس پہنچنا۔
دوم۔ ان احکام کی لوگوں میں تبلیغ۔
سوم۔ ملکی سیاست اور نفاذ احکام اور محافظت احکام شریعت کی قوت اور اہل ملک کی حفاظت اور قوت اور طاقت سے مخالفین کی مدافعت۔

پہلا۔ امر رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر ختم ہو گیا۔

اور اس امر میں کوئی شخص رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ اور نائب نہ تھا۔ اور نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے امر میں تمام فقہا اور علما اور محدثین جو احکام شریعت محمدیہ علے صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی لوگوں میں تبلیغ کرتے ہیں۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ یا نائب متصور ہو سکتے ہیں۔ اور اسی واسطے بعض مفسرین نے آیت یا ایہا الذین امنوا اطیعو اللہ و اطیعو الرسول واولی الامر منکم میں جو لفظ اولی الامر کا ہے۔ اس میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام اور علما اور فقہا کو داخل کیا ہے۔

تیسرے امر میں وہ لوگ جو کسی کو اپنے قبضہ میں رکھتے ہیں اور اس کی سیاست کے مختار ہیں اور نفاذ احکام اور محافظت احکام شریعت کی قوت اور اہل ملک کی حفاظت اور قوت اور طاقت سے مخالفین کی مدافعت کر سکتے ہوں۔ وہ لوگ اس امر میں خلیفہ یا نائب رسول تصور ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ خود صفات اور اخلاق محمدی سے موصوف اور تمام احکام شرعی کے پابند ہوں۔ اور تقدس ظاہری اور باطنی ان کو حاصل ہو۔ اور بعض مفسرین نے سرداران لشکر اسلام کو بھی اولی الامر میں شامل کیا ہے۔ جن کے ماتحت بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔

سلاطین اسلام جو کسی ملک پر سلطنت رکھتے ہوں۔ ممکن ہے کہ اس تیسرے امر کے لحاظ سے اپنے تئیں خلیفہ کے لقب سے ملقب کریں۔ مگر ان کی خلافت یا سلطنت اسی ملک پر اور اسی ملک کے مسلمان باشندوں پر محدود رہے گی جو ان کے قبضہ اقتدار میں ہے نہ اس ملک کے مسلمان باشندوں پر جو ان کے قبضہ حکومت میں نہیں ہیں۔ اس لئے کہ خلیفہ کو ضرور لازم

ہے کہ وہ ملک پر قبضہ اور سلطنت رکھتا ہو۔ اور احکام حدود و قصاص اس میں جاری کر سکتا ہو۔ اس کا حکم اس میں جاری ہو۔ دین کی حمایت کرتا ہو۔ دشمنوں کے ہاتھ سے اس ملک کو اور اس ملک کے باشندوں کو محفوظ رکھ سکتا ہو۔ اور اس ملک میں امن قائم رکھنے کی قوت اس کو حاصل ہو۔ پس جس ملک میں کسی مسلمان بادشاہ کو ایسا اختیار اور اقتدار نہ ہو۔ وہ اس ملک کے لئے یا اس ملک کے مسلمان باشندوں کے لئے خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ نہ خلیفہ کہلایا جا سکتا ہے۔

سلطان ترکی کے خلیفہ ہونے کی نسبت جو اس پر بحث کی جاتی ہے کہ وہ نسل قریش سے نہیں ہیں اور جو لوگ ان کو خلیفہ جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ وہ روایت جس میں خلیفہ کے قریشی النسل ہونے کا ذکر ہے صحیح نہیں ہے۔ ہم ان تمام بحثوں سے قطع نظر کرتے ہیں۔ اور سلطان کو خلیفہ تسلیم کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اگر وہ خلیفہ ہیں تو اس ملک کے اور اس ملک کے مسلمان باشندوں کے خلیفہ ہو سکتے ہیں۔ جن میں ان کی حکومت ہے اور جس میں ان کو قتل و قصاص اور احکام دین کے قائم رکھنے کا اختیار اور اقتدار حاصل ہے نہ اس ملک کے جہاں ان کو مطلق اقتدار اور اختیار حاصل نہیں ہے نہ وہ قتل و قصاص کے احکام کو جاری کر سکتے ہیں نہ دین کو قائم رکھ سکتے ہیں نہ وہاں کے مسلمانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں ایسے ملک میں وہ شرط نہیں پائی جاتی جو خلیفہ ہونے کے لئے ضروری ہے۔ اور اس لئے وہ اس ملک یا اس ملک کے مسلمان باشندوں کے لئے خلیفہ نہیں ہو سکتے۔

ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے گورنمنٹ انگریزی کی رعیت ہیں اور گورنمنٹ انگریزی میں مستامن ہو کر رہتے ہیں۔ گورنمنٹ انگریزی نے ہم کو امن دیا ہے اور ہم کو ہر طرح پر مذہبی آزادی بخشی ہے۔ باوجودیکہ گورنمنٹ انگریزی عیسائی مذہب رکھتی ہے۔ اگر کوئی عیسائی مسلمان ہو جاوے تو وہ اسی طرح کچھ مزاحمت نہیں کرتی جس طرح کہ کسی مسلمان کے عیسائی ہو جانے سے نہیں کرتی۔ مشنری پادریوں کو گورنمنٹ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ جس طرح کہ وہ وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح سینکڑوں مسلمان مذہب اسلام کا وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان عیسائی ہو جاتا ہے تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی عیسائی بھی مسلمان ہو جاتا ہے۔ پس گورنمنٹ انگریزی نے ہم مسلمانوں کو جو بطور رعیت کے مستامن ہو کر اس کی عملداری میں رہتے ہیں۔ کافی طور پر مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ علاوہ اس کے

گورنمنٹ انگریزی میں ہماری جان و مال کی حفاظت ہوتی ہے۔ ہمارے تمام حقوق جو نکاح طلاق وراثت وصیت۔ ہبہ ووقف سے متعلق ہیں بموجب شرع اسلام کے ہم کو ملتے ہیں۔ گو کہ اس قسم کے مقدمات ایک عیسائی حاکم کے سامنے پیش ہوں۔ کیونکہ عیسائی حاکم مجبور ہے کہ ان کو بموجب شرع اسلام کے فیصل کرے اور اس لئے ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم گورنمنٹ انگریزی کے خیر خواہ اور وفادار رہیں اور کوئی بات قولاً و فعلاً ایسی نہ کریں جو گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی اور وفاداری کے برخلاف ہو۔

سلطان عبدالحمید خان خلد اللہ ملکہ کی ہم رعیت نہیں ہیں۔ نہ ان کو ہم پر یا ہمارے ملک پر کسی قسم کا اقتدار حاصل ہے۔ پس وہ بلاشبہ ایک مسلمان بادشاہ ہیں اور بوجہ اتحاد اسلامی کے ہم ان کی بھلائی سے خوش اور برائی سے ناخوش ہوتے ہیں۔ مگر کسی طرح نہ شرعاً نہ مذہباً ہم پر خلیفہ ہیں نہ خلیفہ ہو سکتے ہیں اگر ان کو کوئی حق خلافت ہے تو وہ اسی ملک پر اور اسی ملک کے مسلمانوں پر محدود ہے جو ان کی عملداری میں رہتے ہیں۔

تاریخ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جن مسلمان بادشاہوں نے لقب خلیفہ کا اختیار کیا۔ ان کی خلافت اسی ملک اور اسی ملک کے باشندوں پر محدود رہی ہے۔ جو ان کی سلطنت میں شامل اور ان کے قبضہ اقتدار میں داخل تھے اور جو لوگ ان کی سلطنت میں نہ تھے ان کی خلافت یا امامت یا سلطنت سے ان کو کچھ تعلق نہ تھا۔ چنانچہ اس مقام پر ہم تاریخانہ طور سے خلفاء کے سلسلہ کو بیان کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہو گا کہ ان کی خلافت اسی حد تک محدود تھی۔ جس قدر ملک ان کے قبضہ میں تھا۔

حضرت ابوبکر جو بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہوئے بلاشبہ وہ پسند فرماتے تھے کہ خلیفہ رسول اللہ کہلاویں۔ مگر جب حضرت عمرؓ ان کے جانشین ہوئے تو یہ بات پسندیدہ نہیں تھی کہ حضرت عمر خلیفہ رسول اللہ کہلاویں اس لئے بجائے اس لقب کے امیر المونین کا لقب اختیار کیا گیا جس کے معنی ہیں مسلمانوں کے سردار۔ یہ ہی لقب حضرت عمر کا اور حضرت عثمان اور حضرت علی مرتضےٰ کا اور حضرت امام حسن علیہم السلام کا رہا۔

جب حضرت امام حسن نے خلع خلافت کی اور معاویہ ابن سفیان کے ہاتھ حکومت آئی اور ۴۱ ہجری مطابق ۶۶۱ء عیسوی کے دمشق دارالخلافہ ٹھیرا۔ اس وقت ان کا لقب بھی امیر المومنین رہا اور آج تک امیر معاویہؓ کے لقب سے مشہور ہیں۔ مگر جو کہ خلیفہ کا لقب زیادہ

مقدس سمجھا جاتا تھا کہ اس میں اشارہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا نکلتا تھا۔ اس لئے وقتاً فوقتاً جو کوئی بنی امیہ میں سے جانشین ہوا۔ اس نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ جو درحقیقت بمعنی سلطان کے تھا۔

اس کے بعد بنی عباس نے بنی امیہ کو مغلوب کیا اور ۱۳۷ ہجری مطابق ۷۵۴ عیسوی کے السفاح نے حکومت حاصل کی اور المنصور نے بجائے دمشق کے بغداد کو دارالخلافہ بنایا اور جو لوگ وقتاً فوقتاً بنی عباس میں سے جانشین ہوتے گئے۔ سب نے اپنا لقب خلیفہ کا اختیار کیا۔ خلفائے بنی اُمیہ معدوم ہو گئے اور خلفائے بنی عباس کا دور دورا ہو گیا۔

المقتدر باللہ عباسی بغداد میں خلیفہ موجود تھا اسی کے عہد میں ایک خلافت افریقہ میں قائم ہو گئی یعنی ۲۹۷ ہجری مطابق ۹۰۹ عیسوی کے عبداللہ المہدی نے افریقہ میں بمقام قیروان ان خلافت کی بنیاد ڈالی اور ۳۴۱ ہجری مطابق ۹۵۲ کے المعز باللہ نے قیروان سے مصر کو دارالخلافہ ٹھیرایا۔ عبداللہ المہدی اور اسکے جانشین سب علوی تھے اور سب نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ اب اسلامی دنیا میں دو خلیفہ مستقل بااقتدار و اختیار پیدا ہو گئے۔ ایک خلفائے بنی عباس بغداد میں دوسرے خلفائے علویین قیروان یا مصر میں۔

۱۳۸ ہجری مطابق ۷۵۵ء کے عبدالرحمٰن الداخل اندلس میں داخل ہوا۔ چند روز تو اس کے جانشینوں نے خلیفہ کا لقب اختیار نہیں کیا۔ مگر جب المقتدر باللہ کے زمانہ میں جو بغداد میں خلیفہ تھا۔ یعنی ۳۰۰ ہجری مطابق ۹۱۲ء کے عبدالرحمٰن ناصر تخت پر بیٹھا اس نے اور اس کے بعد جو جانشین ہوئے۔ انہوں نے لقب خلیفہ کا اختیار کیا۔ جن کا دارالخلافہ قرطبہ تھا۔

اب اسلامی دنیا میں تین خلیفہ مستقل اور بااقتدار و اختیار پیدا ہو گئے۔ ایک خلفائے بنی عباس بغداد میں اور خلفائے علویین مصر میں اور عبدالرحمٰن ناصر اور اس کے جانشین اندلس میں یہ تینوں خلیفہ اپنے تئیں اسی ملک کا خلیفہ سمجھتے تھے۔ جو ان کے قبضہ اقتدار میں تھے۔ ہر ایک خلیفہ کے دربار میں قاضی اور مفتی سب موجود تھے۔ اور اپنے اپنے ملک کے خلیفہ کے حکم اور مرضی سے فقہ کے احکام جاری کرتے تھے۔ بغداد کی عباسی خلافت میں عدالتیں فقہ حنفی پر عملدرآمد کرتی تھیں۔ مصر کی فاطمی حکومت میں فقہ اسمٰعیلی کا رواج تھا۔ اور اندلس کے اموی خاندان کی عدالتوں میں فقہ مالکی جاری تھی اور وہ ہر ایک کی خلافت کو اس ملک میں جو اس کی سلطنت میں تھا جائز قرار دیتے تھے۔ پس ان تمام حالات سے ظاہر ہے کہ سلطان

عبدالحمید خاں خلد اللہ ملکہ نہ ہم مسلمانوں کے لئے جو رعایائے گورنمنٹ انگریزی ہیں خلیفہ ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں اس میں کچھ شبہ نہیں۔ کہ سلطان ترکی حافظ حرمین شریفین ہیں بلکہ حافظ احرام شریفہ ہیں جن میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اور بیت المقدس یعنی یروشلم جو مقام مقدس یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کا ہے داخل ہیں۔ مگر اس سے اور خلیفہ ہونے سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام یا خلیفہ ہر زمانہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک ہی ہونا لازم ہے۔ اور اس لئے سلطان ترکی کو وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا خلیفہ قرار دیتے ہیں مگر یہ محض غلط رائے ہے۔ کیونکہ اس بات کا ثبوت کہ تمام دنیا میں ایک امام یا خلیفہ ہو نہ قرآن مجید سے ہوتا ہے نہ کسی حدیث سے۔ کوئی شخص آج تک نہ ایسا ہوا ہے اور شاید ہو گا بھی نہیں جس کی حکومت و سلطنت تمام دنیا پر ہو۔ مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں اور جب ایسے ملکوں میں ہوں جن میں کسی مسلمان بادشاہ کی حکومت و سلطنت نہیں ہے تو وہاں نہ کوئی مسلمان ان مسلمانوں پر جو وہاں رہتے ہیں خلیفہ ہو سکتا ہے نہ امام زمان جس کو مرادف خلیفہ تصور کیا جاتا ہے اور یہ رائے تاریخ کے بھی برخلاف ہے۔ کیونکہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ ایک وقت میں تین خلیفہ گزرے ہیں۔ جن کو ان ملکوں کے رہنے والے مسلمان علماء و قاضی و مفتی جو ان کی حکومت میں رہتے تھے خلیفہ برحق قرار دیتے تھے۔

ہاں مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کے قریب جب حضرت عیسیٰؑ آسمان سے اتریں گے اور حضرت امام مہدی پیدا یا ظاہر ہونگے تو حضرت امام مہدی تمام دنیا کے امام ہونگے۔ اس وقت جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک تو نہ حضرت عیسیٰؑ آسمان پر سے اترنے والے ہیں نہ مہدی موعود پیدا یا ظاہر ہونے والے ہیں۔ کیونکہ جتنی روایتیں اس باب میں ہیں وہ ثابت نہیں ہیں اور اکثر ان میں کئی موضوع ہیں۔

بعض روایتوں پر استدلال کیا جاتا ہے کہ ہر مسلمان کو امام زمان کا جاننا اور اس سے بیعت کرنا واجب ہے۔ گو یہ روایتیں بھی قابل وثوق اور لائق اعتبار نہیں ہیں مگر ہم اس پر کچھ بحث کرنا نہیں چاہتے اور ان کے تسلیم کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے خلیفہ کا جس کی سلطنت میں وہ رہتا ہے۔ جاننا اور اس سے بیعت کرنا ضروری ہے۔ بیعت کا مطلب صرف اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ ہم اس کے مطیع اور تابعدار ہیں اور جو شخص جس کی حکومت میں

رہتا ہو اس کا فرض ہے کہ اس کی تابعداری کرے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو لوگ اس کی حکومت میں نہیں رہتے وہ بھی اس کی تابعداری کا اقرار کریں۔ غرضیکہ کوئی مسلمان بادشاہ ان مسلمانوں کے لئے جو اس کی سلطنت میں نہیں رہتے خلیفہ نہیں ہو سکتا۔

خلافت اور خلیفہ

خلافت کے معنی جانشین ہونے کے ہیں۔ اور خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کا جانشین ہو۔ مگر اب خلافت ایک مذہبی لفظ ہو گیا ہے۔ اور خلیفہ بھی ایک مذہبی عہدہ کا خیال کیا جاتا ہے۔ ابتدا اس کی رومن کیتھولک مذہب سے ہوئی۔ سب سے بڑا افسر سینٹ پیٹرز چرچ کا حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے حواری سینٹ پیٹرز کا جانشین سمجھا جاتا ہے جس کو پوپ کہتے ہیں۔

رومن کیتھولک کے اعتقاد میں پوپ معصوم ہے۔ یعنی اس سے کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ رومن کیتھولک کا یہ اعتقاد ہے کہ پوپ کو دین و دنیا اور نجات آخرت تینوں باتوں کے اختیارات حاصل ہیں۔ اور ہر ایک پوپ کو یہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس زمانہ میں بھی جو ہولی پوپ ہے اس کو بھی یہ اختیارات حاصل ہیں۔

دنیوی امور میں اختیار ہونا تو ایک ظاہری امر ہے۔ دینی اختیار ہونے میں سے یہ مراد ہے۔ کہ جو حکم وہ دینی امور میں صادر کرے۔ وہی مانا جاوے خواہ وہ پہلے احکام دینی کے موافق ہو۔ یا برخلاف اور گو کہ اس نے ناجائز امر کو جائز۔ یا جائز امر کو ناجائز عموماً کر دیا ہو۔ یا کسی شخص کے لئے کر دیا ہو۔ نجات آخرت سے یہ مراد ہے۔ کہ اس کو لوگوں کے گناہ معاف کر دینے کا جب کہ وہ پوپ کے سامنے اپنے گناہ بیان کرے اور معافی چاہیں۔ بالکل اختیار ہے۔ اور جب پوپ ان گناہوں کو معاف کرے۔ تو وہ شخص ایسا ہی پاک صاف ہو جاتا ہے۔ کمن لا ذنب لہ۔ اور آخرت میں ان گناہوں کی بابت کچھ اس سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی پوپ کو اختیار ہے۔ کہ مرے ہوئے لوگوں کو گناہوں سے نجات دے اور بہشت میں داخل کرے۔ اسی لئے پوپ کی ٹوپی گول اور لمبی ہوتی ہے۔ اس کی چوٹی پر صلیب کی صورت بنی ہوتی ہے اور ٹوپی کے گرد تین تاج ہوتے ہیں۔ پہلے تاج سے دنیوی اختیار مراد ہے۔ اور دوسرے تاج سے دینی اختیار۔ اور تیسرے تاج سے آخرت کا اختیار۔

مسلمانوں میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت ابو بکر رضے اللہ عنہٗ آنحضرت کے جانشین قرار پائے۔ اور ان کو خلیفہ رسول اللہ کا لقب بھی ملا۔ مگر وہ ایسے خلیفہ نہیں تھے۔ جیسا کہ رومن کیتھولک اپنے پوپوں کو سمجھتے ہیں۔ یعنی ان کو دینی اختیارات کچھ نہیں تھے۔ نہ وہ حرام کو حلال کر سکتے تھے۔ نہ حلال کو حرام۔ صرف ان کا کام یہ تھا۔ کہ جو دینی احکام رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ہیں۔ ان کی تعمیل اور تعلیم کی کوشش کریں۔ اور مسلمانوں کے گروہ کی جو ضروریات ہیں۔ ان کو پورا کریں۔ اور مطلق ان کو اختیار نہ تھا۔ کہ کسی دینی حکم کو منسوخ کریں۔ یا کوئی نیا حکم دین میں جاری کریں۔ اور آخرت کا اختیار ان کو مطلق نہیں تھا۔ نہ وہ کسی کے گناہ معاف کر سکتے تھے۔ نہ کسی کو بخشوا سکتے تھے۔

ہولی پوپ جو دینی حکم دیتا تھا۔ اس میں کسی کو چون وچرا کرنے کی مجال نہ تھی۔ مگر اسلام میں جن کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ ان کے احکام دینی میں ہر شخص کو حق تھا۔ کہ اگر وہ خدا اور رسول کے حکموں کے برخلاف ہوں تو ان کو نہ مانے۔ اور اس پر حجت کریں۔ غرضیکہ جن کو مذہب اسلام میں خلیفہ کہا جاتا ہے۔ ان کو خلافت فی النبوہ۔ یعنی مذہبی احکام کے وضع کرنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ بلکہ وہ صرف خلیفہ النبی تھے۔ جس سے یہ مراد ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کو قائم رکھیں۔ اور مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کریں۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ حضرت ابو بکر صدیق کو خلیفہ رسول اللہ کہا گیا ہے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کے زمانہ سے یہ لفظ متروک ہو گیا۔ اور بجائے اس کے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا گیا۔ جو بالکل صحیح اور نہایت موزوں اور واقع کے مطابق تھا۔

حضرت علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہٗ کے زمانہ تک اور ان کے بعد بھی چند روز تک بجائے خلیفہ کے امیر المومنین کا لفظ زیادہ تر استعمال ہوتا تھا۔ مگر ان کے بعد اور امام حسین علیہ السلام کے زمانہ کے بعد جن لوگوں نے اقتدار حاصل کیا انہوں نے اس خیال سے کہ خلیفہ کا لفظ امیر المومنین کے لفظ سے زیادہ مقدس ہے اپنے تئیں خلیفہ کے لفظ سے تعبیر کیا۔ جیسے کہ خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس نے اپنے نام کے ساتھ خلیفہ کا بھی لفظ شامل کر لیا تھا۔ مگر یہ امر غور طلب ہے۔ کہ خلیفہ یا امیر المومنین کا ہونا۔ قریش کی نسل کے لوگوں پر منحصر ہے یا نہیں۔

اس باب میں مختلف روائتیں ہیں۔ مستدرک حاکم میں اور اس کی دوسری کتاب میں جو

کیتوں کے بیان میں ہے۔ حضرت انس سے ایک روایت لکھی ہے۔ اس میں ہے۔ الامراءُ من قُریش اور مستدرک حاکم۔ اور سنن بیہقی میں حضرت علی مرتضیٰ کی روایت سے لکھا ہے۔ اَلائمۃ من القریش۔ مسند امام احمد حنبل۔ اور بخاری۔ اور صحیح مسلم میں ابن عمر سے جو روایت ہے اس میں لکھا ہے۔ لایزال ھذا الامرفی قریش۔ اور معجم طبرانی اور مسند امام احمد حنبل میں ذی مجمر کی روایت میں ہے۔ کان ھذا الامرفی حمیر فنزعہ اللہ منھم و جعلہ فی قریش۔ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہذا الامر سے قوم کی سرداری یا حکومت مراد ہے۔ کیونکہ حمیر کی قوم سے خلافت رسول اللہ تو کسی طرح متصور ہو نہیں سکتی۔ پس صاف ظاہر ہے۔ کہ ہذا الامر سے قوم کی سرداری اور حکومت مراد ہے۔ نہ خلافت مصطلحہ۔

اور مسند امام حنبل اور مسند ابی یعلی۔ اور صحیح ابن حبان اور جامع ترمذی میں سفینہ سے روایت ہے۔ الخلافۃ بعدی۔ فی اُمتی ثلاثون سنۃ ثم ملک بعد ذلک۔

سنن ابو داؤد۔ اور مستدرک حاکم میں سفینہ ہی سے روایت ہے۔ خلافت النبوۃ ثلاثون سنۃ ثم یوتی اللہ الملک من یشاء۔ اور معجم طبرانی۔ اور شعب الایمان بیہقی۔ اور کتاب المعرفۃ ابو نعیم میں معاذ اور ابو عبیدہ بن الجراح سے روایت ہے کہ "ان ھذا الامربدا۔ رحمۃً و نبوۃً ثم یکون رحمۃً وخلافۃً ثم کائن ملکاً عضوضاً ثم کائن عتواً وجبریۃً وفساداً فی الارض۔

یہ تمام روائتیں جو ہم نے بیان کیں۔ منتخب کنزالعمال فی سنن الافعال والاقوال۔ میں مندرج ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ تمام روائتیں مجرح و مقدوح ہیں۔ اور لائق اعتبار نہیں۔ مگر ہم اس آرٹیکل میں اس امر پر بحث نہیں کرتے۔ بلکہ انہیں روائتوں کو قابل قبول تسلیم کر کے کہتے ہیں۔ کہ ہرگاہ خلافت کا اختتام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تیس برس بعد مذکور ہو چکا ہے۔ اور وہ تیس برس خلع خلافت حضرت امام حسن علیہ السلام پر ختم ہوتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ ان کے بعد جو لوگ صاحب حکومت و سلطنت ہوئے ہم ان کو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ مصطلح قرار دیں۔ خواہ وہ قرشی ہوں۔ خواہ غیر قرشی۔

پس خلافت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد جو لوگ صاحب حکومت ہوئے وہ لوگ بادشاہ یا سلطان یا والی ملک یا امیر وغیرہ قرار پا سکتے ہیں۔ اور جو مذہبی تعلق ہم مسلمانوں کو ان خلفائے سے تھا۔ جو زمانہ تیس برس بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں ہوئے۔ وہ ان حاکموں سے نہیں ہو سکتا۔ جو بعد تیس برس مذکور کے ہوئے۔ خواہ وہ اپنا نام خلیفہ رکھیں۔ یا

سلطان یا امیر یا جو کچھ چاہیں۔ پس کسی مسلمان حاکم کو جو کسی ملک میں حکومت رکھتا ہو۔ بجز ایک مسلمان حاکم کے اور کچھ نہیں خیال کر سکتے۔ نہ اس کو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ ہاں بیشک اسلامی اتحاد اس کے ساتھ رکھتے ہیں۔ اس کی بھلائی و بہتری سے خوش اور اس کی برائی و ذلت سے غمگین ہوتے ہیں۔ سلطان ترکی کی اس فتح سے جو اس وقت یونانیوں پر حاصل ہوئی ہے۔ یہ سبب اس اتحاد قومی کے جو اسلام نے مسلمانوں پر قائم کیا ہے۔ مسلمان نہایت خوش ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ترکوں کو شکست ہوتی۔ تو ہم کو اسی اتحاد کے سبب ضرور رنج ہوتا۔ اور یہ ایک امر انسان کا طبعی ہے۔ جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

یونانی ہمارے حاکم نہیں ہیں۔ ہم ان کی رعیت نہیں ہیں۔ پس ہم کو یہ کہنے میں کہ خوب ہوا یونانیوں نے شکست پائی اور ذلیل ہوئے اور خدا کا شکر ہے کہ ترکوں نے فتح پائی۔ کیا تامل ہے۔ ہم کو ہرگز نہیں معلوم ہے۔ کہ گورنمنٹ انگریزی کی جس کے امن میں بطور رعیت ہم مسلمان رہتے ہیں۔ اس لڑائی میں جو ترکوں اور یونانیوں سے ہوئی۔ کیا پالیسی ہے۔ اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہے۔ ہم کو اس پر یقین نہیں۔ اور کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ لوگ وہ بات کہتے ہیں کہ ان کو درحقیقت معلوم نہیں۔ اور اگر بالفرض انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہو۔ تب بھی ازروئے مذہب کے جو ہمارا فرض اپنے حاکموں کی اطاعت اور فرماں برداری کا ہے۔ اس سے ہم کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اور ایسی حالت میں بھی ہمارا فرض ہے کہ اپنی گورنمنٹ کے مطیع فرمانبردار اور وفادار رہیں۔ بہت سے بہت اگر کچھ کر سکتے ہیں۔ تو یہ ہے کہ خدا سے دعا کیا کریں۔ کہ برٹش گورنمنٹ اور مسلمانوں کی سلطنتوں میں خواہ وہ ٹرکی کی ہو۔ یا ایران یا افغانستان کی یا اور کسی دور دراز ملک کی۔ دوستی اور ارتباط رہے۔ اور کبھی مخالفت پیدا نہ ہو۔

امام اور امامت

اس مقام پر امام کے لفظ سے ہماری مراد اس شخص سے نہیں ہے جو سب کے آگے کھڑا ہو کر لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے۔ بلکہ ایسے شخص سے مراد ہے۔ جو بہ سبب کمال نفسی و روحانی یا علمی و عملی کے امام کے لفظ سے مخاطب کیا جاتا ہے۔

رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں علاوہ نبوت اور نفاذ احکام اور محافظت مسلمین کے جو آنحضرت کے بعد شان خلافت سے متعلق ہیں۔ ذاتی کمالات اور اعلیٰ درجہ کی صفات بھی تھیں۔ پس ان صفات کمال میں مشابہت پیدا کرنا۔ اس کمال میں امامت کے درجہ پر پہنچنا ہے۔

مثلاً رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو علم دین میں محققاً بذریعہ وحی یا الہام کے جو مقتضائے فطرت نبوت تھا۔ اعلیٰ درجہ کا کمال حاصل تھا۔ اور گو اس درجہ کا کمال کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر جن لوگوں نے علم دین اور احکام شریعت کے سمجھنے اور نکالنے میں نہ بطور تقلید بلکہ بطور اجتہاد کوشش کی اور اس کو حاصل کیا۔ اور جم غفیر مسلمانوں نے اس کو قبول و تسلیم کیا۔ گو کہ اس میں خطا کا احتمال بھی ہو انہوں نے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے کمال دینی میں ایک قسم کی مشابہت پیدا کی۔ اور اس کمال میں درجہ امامت حاصل کیا اور تمام لوگوں نے اس فن میں ان کو تسلیم کیا جیسے کہ مجتہدین اربعہ امام۔ ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ۔ امام احمد حنبل رضی اللہ عنہ۔ امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین تھے۔

یا مثلاً جو تقدس ذاتی اور صفات روحانی اور علم دینی و روحانی رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ اس کو آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے حاصل کیا خواہ تعلیماً خواہ وحیاً اور اس کمال میں رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشابہت پیدا کی۔ اس لئے جم غفیر مسلمانوں نے ان کو اس کمال میں امام تسلیم کیا اور آئمہ اہل بیت سے ملقب ہوئے۔

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو علم عقاید تحقیقاً یا ازروئے وحی یا الہام کے حاصل تھا جو دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس اس میں مشابہت کا حاصل کرنا صرف استدلال پر منحصر تھا۔ پھر جس نے استدلال سے اس کو حاصل کیا۔ گو کہ اس میں غلطی کا بھی احتمال ہو۔ اور جم غفیر مسلمانوں نے اس کو تسلیم کیا۔ اس نے اس فن میں امام کا درجہ پایا۔ جیسا کہ امام غزالی اور امام فخرالدین رازی و دیگر علمائے علم کلام اس فن میں درجہ امامت کو پہنچے تھے۔

علاوہ اس کے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم میں اور بہت سے کمالات ذاتی تھے۔ جیسے تقدس روحانی۔ استغراق فی ذآت اللہ۔ توجہ الی اللہ تعمیل حکم ربانی۔ حلم۔ رحمت۔ شفقت علے المسلمین وغیرہ وغیرہ پس جو شخص کمالات مصطفوی کے کسی کمال سے اپنے تیئں مشابہ کرتا ہے وہی اس کمال کا امام ہوتا ہے۔ خواہ وہ لںام کے نام سے مشہور ہوا ہو یا نہیں۔

اور جس نے جو تمام روحانی اور اخلاقی صفات محمدی علے صاحبہا الصلوۃ والسلام میں مشابہت پیدا کی ہو اور ملک بھی اس کی حکومت میں ہو جس میں اس کو احکام شرعی کے نفاذ اور مسلمانوں کی ہدایت اور حفاظت کا اختیار حاصل ہو۔ بلاشبہ وہ شخص بھی اس ملک کے لئے جو اس کی حکومت میں ہے۔ خلیفہ رسول اللہ اور امام کے لقب سے ملقب ہونے کا مستحق ہے اور اگر اس نے اپنے تیئں ان صفات کمال کے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں تھیں مشابہ نہیں کیا۔ اور کسی ملک کی حکومت حاصل کی جیسا کہ بنی امیہ و بنی عباس نے تو وہ درحقیقت اس ملک کے لئے اور اس ملک کے مسلمان رہنے والوں کے لئے سلطان ہے نہ امام۔ اور نہ خلیفہ رسول اللہ۔ گو کہ اس نے فخریہ طور پر خلیفہ کا لقب اختیار کیا ہو اور بزور حکومت اپنے تیئں خلیفہ کہوایا ہو۔ اسی لئے اس نے اپنے اجتہاد سے جو احکام متعلق مذہب کے دئے ہوں وہ وقعت سے نہیں دیکھے جاتے۔

اور اگر اس نے اپنے تیئں صفات کمال رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے مشابہ کیا ہے اور کوئی ملک اس کی حکومت اور قبضہ اقتدار میں نہیں ہے۔ جس میں وہ احکام شرعی کو نافذ اور وہاں کے مسلمانوں کی حفاظت کر سکے تو وہ صرف انہی امور میں جن میں اس نے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے مشابہت پیدا کی ہے امام ہے مگر اس پر خلیفہ رسول اللہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور اسی وجہ سے آئمہ اہل بیت علیہ السلام امام کے لفظ سے ملقب ہوئے ہیں۔

مگر فرق اسلامیہ میں امام کا مرتبہ قرار دینے میں اختلاف ہے۔ شیعہ تو امام کو معصوم اور منصوب من اللہ اور مفروض الطاعت قرار دیتے ہیں۔ اور یہ کرامت حضرت امام مہدی علیہ السلام پر جو آئمہ اہل بیت کے اخیر امام ہیں ختم ہو گئی۔ وہ پیدا ہوئے تھے۔ اور سر من رائے کی غار میں غائب ہو گئے ہیں۔ مگر اب تک زندہ ہیں اور امام العہد و الزمان ہیں اور قیامت کے قریب ظاہر ہونگے اور اس لئے کوئی دوسرا شخص امام نہیں ہو سکتا۔

مگر اہل سنت و جماعت کسی امام کو منصوب من اللہ اور معصوم عن الخطاء قرار نہیں دیتے۔ بلکہ وہ سوائے پیغمبر کے کسی کو گو کہ وہ کیسا ہی مقدس، ذی علم اور صاحب فضل و کمال ہو معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے۔

نتیجہ اس اختلاف کا یہ ہے کہ شیعہ تو امام کے حکم تمام دنیا کے شیعہ مسلمانوں پر بے چون و چرا واجب التعمیل سمجھتے ہیں مگر جو کہ ان کے امام دنیا کی آنکھوں سے غائب ہیں اس لئے اس زمانہ میں کوئی ایسا حکم ان کے لئے وجود پذیر نہیں ہو سکتا جس کی اطاعت تمام دنیا کے شیعہ مسلمانوں پر واجب ہو۔

اہل سنت و جماعت کسی امام موجودہ یا گزشتہ کا حکم تمام دنیا کے سنی مسلمانوں پر بے چون و چرا واجب التعمیل نہیں سمجھتے۔ جو لوگ بے پڑھے یا کم استعداد ہیں وہ تو جس امام کے معتقد ہیں یا جس کے ان کے باپ دادا معتقد تھے اسی کی پیروی کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ذی استعداد اور قابل ہیں وہ جب تک اس بات کو نہ سمجھ لیں کہ وہ حکم امام کا صحیح اور کتاب اللہ سنت رسول اللہ کے مطابق ہے اس کو واجب التعمیل نہیں جانتے۔ اور اسی سبب سے اہل سنت و جماعت میں تقلید اور عدم تقلید امام معین پر بحث چلی آتی ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ قرون مشہود لھا بالخیر میں اور اس کے بعد تک بھی یعنی جب تک فقہ کی کتابیں مرتب ہوئیں، کوئی شخص کسی کی تقلید پر مجبور نہیں تھا۔ اگر کوئی مسئلہ کسی کو معلوم نہیں تھا تو وہ کسی عالم سے جس سے اس کا جی چاہتا تھا، پوچھ لیتا تھا۔

غرضیکہ سنیوں میں بعد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا کہ مذہبی امور میں اس کا حکم تمام دنیا کے مسلمانوں پر واجب التسلیم ہو۔ خود صحابہ متعدد مسائل مذہبی میں مختلف الرائے تھے۔ اور ایک دوسرے کی رائے کو واجب التسلیم نہیں سمجھتا تھا۔ مثلاً اکثر صحابہ معراج جسمانی کے قائل تھے۔ مگر حضرت عائشہ کو معراج جسمانی سے انکار تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر سماع موتی کے قائل تھے مگر بعض صحابہ اس کے سخت مخالف تھے۔ حضرت ابو ہریرہ کا عقیدہ تھا کہ عزیزوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب نازل ہوتا ہے، حضرت عائشہ اس کے مخالف تھیں۔ یہ اختلاف صحابہ میں عقائد کا تھا۔ اسی طرح وہ فقہی مسائل میں بھی باہم مختلف تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اس بات کے قائل تھے کہ وضو میں اعضاء کو ایک ایک بار دھونا چاہئے۔ مگر حضرت ابو ہریرہ

کے نزدیک دو دو بار دھونا لازم تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہ ؓ تو فجر کی نماز میں دعاء قنوت پڑھنے کو لازمی قرار دیتے تھے مگر حضرت ابو مالک اشجعی کو اس سے انکار تھا۔ اکثر صحابہ مسح علی الخفین کو جائز سمجھتے تھے مگر حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح اور بہت سے مسائل ہیں جس میں صحابہ اور تابعین آپس میں مختلف الرائے تھے اور ایک دوسرے کی رائے کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔

موجودہ زمانہ کے حالات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو امام کا رتبہ رکھتا ہو۔ اور نہ کوئی شخص گو کہ وہ کسی ملک کا حاکم بھی ہو ایسا ہے جو خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہلانے کا مستحق ہو۔ البتہ جو مسلمان کسی ملک پر حکومت رکھتے ہیں، وہ اس ملک کا سلطان کہلانے کے مستحق ہیں اور درحقیقت وہ اس ملک کے سلطان بھی ہیں گو انہوں نے اپنے تئیں کسی لقب سے ملقب کیا ہو۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مذہب اسلام کے رو سے رعیت کو اپنے سلطان کے ساتھ کس طرح پیش آنا لازم ہے۔ اس کا بیان مشکوۃ کی ایک حدیث میں ہے جس کو ہم بعینہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان السلطان ظل اللہ فی الارض یاوی الیہ کل مظلوم من عبادہ فاذا عدل کان لہ الاجر وعلی الرعیتہ الشکر واذا جار کان علیہ الامر وعلی الرعیتہ الصبر"

یعنی ابن عمر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا نقل کیا ہے کہ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے کہ ہر مظلوم اس کے بندوں میں سے اس کی پناہ میں آتا ہے۔ پھر اگر اس نے عدل کیا تو اس کی بھلائی اس کے لئے ہے اور رعیت پر اس کا شکر کرنا فرض ہے اور اگر وہ ظلم کرے تو اس کی برائی اس پر ہے۔ اور رعیت کو اس پر صبر کرنا لازم ہے۔

اس حدیث میں سلطان کا لفظ بغیر کسی قید کے آیا ہے۔ پس وہ سلطان خواہ مسلمان ہو، خواہ یہودی ہو، خواہ عیسائی ہو، خواہ آتش پرست، خواہ بت پرست، اس کے ساتھ اس کی رعیت کو اسی طرح پیش آنا لازم ہے کہ جس طرح کہ اس حدیث میں بیان ہوا ہے۔

اس حدیث میں سلطان کو ظل اللہ اس لئے کہا ہے کہ جس طرح ہر مظلوم خدا کی پناہ ڈھونڈتا ہے، اسی طرح اس کی رعیت کا ہر مظلوم کسی مذہب کا ہو سلطان کی پناہ میں آتا

ہے اور اسی مشابہت سے سلطان کو ظل اللہ کہا ہے۔

اب ہم کو ہندوستان کے مسلمانوں پر غور کرنا ہے جو بطور رعیت کے اور مستامن ہو کر انگلش گورنمنٹ کے ماتحت رہتے ہیں۔ انگلش گورنمنٹ نے ان کے ساتھ عدل و انصاف کرنے میں بقدر اپنی طاقت کے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ان کے تمام معاملات کے فیصلہ کے لئے قانون بنا دیئے ہیں، اور ہر شخص پہلے سے جانتا ہے کہ کسی فعل کا نتیجہ وہ ہے جو قانون میں لکھا ہے۔

مذہبی آزادی انگلش گورنمنٹ نے ہر ایک قوم کو دی ہے۔ تمام مذہب والوں کے مذہبی معاملات ان کے مذہبی مسائل کے موافق عدالت سے فیصل ہوتے ہیں۔ جان اور مال کا امن اور سوائے بغاوت اور شرارت کے ہر قسم کی آزادی انگلش گورنمنٹ کی رعیت کو حاصل ہے۔ پس بالتخصیص مسلمانوں کو مطابق اس حدیث کے جو اوپر مذکور ہوئی انگلش گورنمنٹ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور انگلش گورنمنٹ کی رعایا ہو کر وہ انگلش گورنمنٹ کے ساتھ کسی قسم کا فساد یا مخالفت یا بغاوت قولاً" و فعلاً" نہیں کر سکتے۔

اور حدیث کی کتابوں میں متعدد حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو نہایت تاکید سے نصیحت کی ہے اور فرمایا ہے کہ تم اپنے امیروں اور حاکموں کی ہر حالت میں اطاعت کرو۔ خواہ تمہارے ساتھ ظلم و ستم ہوتا ہو یا وہ انصاف اور مروت سے پیش آتے ہوں۔ ان حدیثوں میں حاکم یا امیر کے ساتھ کوئی شرط یا قید نہیں ہے جس سے یہ بات معلوم ہو کہ حاکم یا امیر کس مذہب کا ہو۔ پس تمام مسلمانوں کو ان حدیثوں کا ماننا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ اور انہی حدیثوں کے رو سے لازم آتا ہے کہ تمام مسلمان جو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے سایہ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں' نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں اور خدا کا شکر کریں کہ اس نے ایسی مہربان اور عادل گورنمنٹ ان کی جان و مال اور عزت اور مذہب پر مسلط کی ہے جو ان کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کرتی ہے اور اس نے ہر طرح کی مذہبی آزادی عنایت کی ہے اور وہ کوئی ایسا حکم نہیں دیتی ہے نہ کبھی دے گی، جس سے ہم کو خدا کی نافرمانی کرنی پڑے۔ اور اس قول پر عمل کرنے کی ضرورت پیش آئے کہ لا سمع ولا طاعتہ فی معصیتہ اللہ۔

علوم دینیہ، علوم عربیہ و فلسفہ یونانیہ کے اسباب تنزلی

ایک کلیہ قاعدہ ہے جو ہر ایک زمانہ اور ہر ایک قوم سے یکساں تعلق رکھتا ہے اور کوئی چیز کسی زمانہ میں اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کی قدر ہوتی ہے اسی کی بہتات ہوتی ہے۔ جس کو انگریزی میں ڈیمانڈ اور سپلائی کے لفظوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ڈیمانڈ اور سپلائی پولیٹکل اکونمی کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ مگر ہم نے ان کی جگہ قدر اور بہتات کے لفظ قائم کئے ہیں۔ تاکہ تمام اشیا مادی و غیرمادی پر حاوی ہوں کیونکہ درحقیقت یہ دو لفظ اشیاء مادی اور غیرمادی دونوں سے برابر تعلق رکھتے ہیں۔

یہ بھی کلیہ قاعدہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ کیا جاتا ہے کسی نہ کسی غرض سے کیا جاتا ہے۔ اور وہ غرض کبھی تو اس کام کا معاوضہ حاصل کرنے کی ہوتی ہے اور کبھی کسی امر میں کمال حاصل کرنے کی جس کے باعث خود اس کے دل میں ایک قسم کا فخر پیدا ہوتا ہے۔ یا اعزاز و تقدس پیدا ہونے کی جس کی لوگ قدر کرتے ہیں۔ یا صرف دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے بغیر کسی ذاتی غرض کے یا بہ نیت خالص تقرب الی اللہ کے۔ پس ان تمام اسباب سے جس چیز کی قدر کی جاتی ہے اسی کی بہتات ہوتی ہے۔

مثلاً عرب جاہلیت میں شاعری کا بہت چرچا تھا ہر سال عکاظ کی منڈی میں شاعر جمع ہوتے تھے۔ اور اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ اور ہر ایک دوسرے پر سبقت لے جانا اور اپنا فخر اوروں پر جتلانا چاہتا تھا جس سے اس کے دل میں بھی ایک قسم کا فخر پیدا ہوتا تھا اور تمام قوم اس کو معزز و معظم سمجھتی تھی۔ اور جزیرہ عرب میں اس کی ناموری ہوتی تھی اور یہی غرض ان کو شاعری سے تھی اور اسی کی قدر ملک میں بھی تھی۔ اس زمانہ میں شاعری کا بڑا عروج تھا۔ نہایت عمدہ شاعروں کے قصیدے خانہ کعبہ میں لٹکائے جاتے تھے جن میں سے سات قصیدے اب تک مشہور و معروف ہیں۔ پھر اسلام کا زمانہ آیا۔ اور کذب کی برائی بتلائی اور بتوں کی پرستش اور ان کی ایسی تعریف کی جو ایک زیور بت پرستوں کی شاعری کا تھا ممانعت ہوئی۔ اور خدا نے فرمایا۔ ”والشعراء یتبعھم الغاوٗن الم تراٰ نھم فی کل وادٍ یھیمون وا نھم یقولون مالا یفعلون“ اس سبب سے شاعری کی وہ قدر نہ رہی جو زمانہ جاہلیت میں تھی۔ اور شاعری کو تنزل ہو گیا۔ امام

فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں نہایت عمدہ بات لکھی ہے کہ اسلام کے بعد تمام شاعروں نے کذب چھوڑ دیا تھا۔ اور سچائی اختیار کی تھی اس سبب سے ان کی شاعری اچھی نہ رہی تھی اور اس میں تنزل ہو گیا تھا۔ لبید اور حسان جب دونوں مسلمان ہو گئے تو ان کے اشعار زمانہ اسلام کی عمدگی اور خوبی میں ان کے ایام جاہلیت کے اشعار کے برابر نہ تھے۔ بااین ہمہ اسلام کے شروع زمانہ میں کچھ شعرا زمانہ جاہلیت کے باقی تھے۔ اور ان لوگوں میں بھی جو زمانہ قریب اسلام میں پیدا ہوئے تھے۔ جاہلیت کے زمانہ کے شعرا کا کچھ اثر تھا۔ جس کی مثال فرزدق میں پائی جاتی ہے کہ جب ہشام ابن عبدالملک حج کو گیا تو طواف میں کثرت ہجوم خلائق سے اس کو حجر اسود تک پہنچنے کا رستہ نہیں ملتا تھا مگر جب ہمارے دادا حضرت امام زین العابدین علیہ السلام طواف کرتے کرتے وہاں پہنچے تو تمام ہجوم کائی کی طرح پھٹ گیا اور حضرت امام کو حجر اسود تک جانے کا راستہ دیدیا۔ ایک شخص نے جو شام کا رہنے والا تھا ہشام سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہیں؟ اس نے تجاہل عارفانہ سے کہا کہ میں نہیں جانتا۔ وہاں فرزدق شاعر بھی موجود تھا ہشام کا یہ کہنا اس کو بہت بُرا معلوم ہوا اس نے حضرت امام کی شان میں فی البدیہہ ایک قصیدہ کہا جس کے یہ چند اشعار ہیں۔

هذا الذی تعرف البطحاء وطاته — والبیت یعرف هوالحل والحرام
هذا ابن خیر عباد الله کلهم — هذا التقی النقی الطاهر العلم
هذا ابن فاطمه ان کنت جاهله — بجده انبیاء الله قد ختموا
ما قال لاقط الافی تشهده — لولا التشهد کانت لاوه نعم

یعنی یہ وہ شخص ہے کہ مکہ کی زمین اس کے نقش قدم کو پہچانتی ہے۔ اور خدا کا گھر اور اسکی بزرگ زمین اور تمام جنگل اور میدان اس کو جانتے ہیں۔ یہ فرزند ہے اس کا جو تمام خدا کے بندوں میں سب سے بہتر تھا۔ یہ ہے بزرگ اور مقدس اور پاک جس کو سب جانتے ہیں۔ یہ ہے فرزند فاطمہ کا گو کہ تو اس کو نہ جانتا ہو۔ اسی کے دادا پر خدا کے نبیوں کی نبوت ختم کی گئی تھے۔ یہ ایسا فیاض ہے کہ بجز کلمہ پڑھنے کے کبھی اس نے "لا" کا لفظ نہیں کہا۔ اگر کلمہ میں بھی "لا" نہ ہوتا تو "لا" کی جگہ وہ "نعم" ہی کہتا۔

زمانہ خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس میں پھر شاعری کی قدر ہوئی۔ مگر شاعری کا رنگ بدلا ہوا تھا نہ اشعار میں عرب جاہلیت کا جوش تھا نہ سادگی اور سلاست باقی رہی تھی۔ ہاں مضامین

دقیق اور نازک جو عرب جاہلیت کے خیال میں بھی نہ تھے اور شاندار لفظ جو عرب جاہلیت کی سادگی کے مقابلہ میں ہیچ تھے شعروں میں داخل ہو گئے تھے۔ مگر عرب جاہلیت کے اشعار تک کب پہنچ سکتے تھے۔ جیسے کہ فارسی میں ظہوری اور نظیری نے بہت کچھ لفاظی اور مضمون آرائی کی۔ مگر حافظ کی شاعری سے جو نہایت سادہ اور آمد کی خوبیوں سے مزین تھی ان کے اشعار جن میں آورد کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کب مقابلہ کر سکتے تھے۔

بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ کے بعد شاعری کی اور بھی قدر گھٹتی گئی اور اسی کے ساتھ اس میں تنزل آ گیا۔ اور اب یہاں تک تنزل آ گیا ہے کہ اگر میں چاہوں تو اپنے تئیں بھی عربی کا شاعر کہنے لگوں۔ گو کہ میں نے کبھی عربی کا شعر نہیں کہا۔ اور نہ کہہ سکتا ہوں۔ بلکہ عربی اشعار کو موزوں پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اس سے بخوبی ثابت ہے کہ جس چیز کی ڈیمانڈ نہیں ہے۔ اس کی سپلائی بھی نہیں ہے یعنی جس چیز کی قدر نہیں ہے اس کی بہتات بھی نہیں ہے۔

مگر یاد رہے کہ جو چیز دنیا میں بکار آمد اور فائدہ مند ہوتی ہے اس کی قدر کبھی نہیں گھٹتی جب تک کہ اس سے زیادہ مفید دوسری چیز پیدا یا ایجاد نہ ہو جائے اور جو چیزیں بطور مشغلہ کے ہوتی ہیں۔ تو جب مشغلہ رکھنے والے نہیں رہتے یا وہ ذریعہ باقی نہیں رہتا جو اس مشغلہ کو قائم رکھے تو ان چیزوں کی قدر گھٹ جاتی ہے شاعری اسی قسم کی چیز تھی جس کی قدر زیادہ تر بطور مشغلہ کے کی جاتی تھی۔ جب وہ نہ رہا تو لازمی طور سے اس کا تنزل ہونا تھا۔ کیونکہ جب ڈیمانڈ نہ رہی تو سپلائی بھی نہ رہی۔

نثر زمانہ جاہلیت کی ہم تک نہیں پہنچی۔ اور جو ٹکڑے نثر جاہلیت کے بعض کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان پر پورا یقین نہیں ہو سکتا کہ وہ خالص جاہلیت کے ہیں اسلام کے قرن اول کا کلام یا خطبات جس قدر ہم کو ملتے ہیں۔ وہ بھی بذریعہ روایات کے ہم تک پہنچے ہیں۔ ان پر بھی پورا یقین نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ خالص کلام قرن اول اسلام کا ہے۔ صرف قرآن مجید ہمارے پاس یقین کے قابل ہے۔ جو ابتدائے اسلام اور آخر عہد جاہلیت کا کلام یقیناً خیال میں آ سکتا ہے۔

قرآن مجید کو ہم وحی متلو یا خدا کا کلام یقین کرتے ہیں۔ مگر جب وہ انسانوں کی زبان میں نہایت فصیح و بلیغ طرز پر وحی ہوا ہے۔ تو اس لئے ہم اس کو اس زمانہ کے لٹریچر سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر وہ کلام ایسا بے نظیر اور بے مثل ہے کہ آج تک نہ کسی سے ویسا ہوا ہے۔ اور ہم

یقین کرتے ہیں کہ نہ مثل اس کے آئندہ ہو سکتا ہے کیونکہ جب ہم نے دیکھا ہے کہ عربی لٹریچر کا روز بروز زوال ہو تا گیا ہے تو یہ پیشین گوئی کرنی کہ آیندہ بھی مثل قرآن کے کوئی تحریر نہیں ہو سکنے کی۔ کوئی نا قابل یقین بات نہیں ہے۔ ان تمام وجوہات سے ہم زمانہ جاہلیت کے نثر سے اسلام کے بعد کی نثر میں جو تنزل ہوا ہے اس کو علانیہ نہیں دکھا سکتے۔ مگر جب کہ فصحائے عرب مثل قرآن کے کوئی تحریر نہ لا سکے تو اس پر یقین ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کے فصحا بھی قرآن کے مثل تحریر کرنے پر عاجز تھے۔

سخت افسوس ان لوگوں پر ہے جو یہ سمجھتے ہیں یا کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی عبارت بھی یکساں نہیں ہے۔ بلکہ بعض آیتیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور بعض مقامات ویسے اعلیٰ درجہ کے نہیں ہیں۔ مگر ایسا کہنا یا سمجھنا ان لوگوں کی نہایت نا سمجھی ہے ادائے کلام مقتضائے اس مضمون کے ہوتا ہے جو ادا کیا جاتا ہے۔ نعیم جنت اور وعید جحیم ایک طرز کلام سے ادا نہیں ہو سکتیں۔ اور نہ ان کو ایک طرز پر ادا کرنا مقتضائے فصاحت و بلاغت ہے۔ جس وقت کہ ایک مضمون قہر آلود واسطے زجر و توبیخ لوگوں کے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ اور لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ترکیب دوسری طرح کی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کو پڑھتے ہیں تو اس وقت صرف وہ لفظ ہی موجود ہوتے ہیں۔ اور جس ٹون سے وہ لفظ ادا کئے گئے ہیں وہ ٹون موجود نہیں ہوتی۔ مگر اس کے الفاظ اور لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ترکیب اس قسم کی ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں وہی ٹون پیدا کر دیتی ہے۔ اور جب کوئی مضمون محبت اور شفقت اور رحم اور عفو کا بیان ہوتا ہے تو اس کے لفظ اور لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ترکیب جدا قسم کی ہوتی ہے اور جب کوئی واقعہ یا حالات بیان کئے جاتے ہیں تو اس کے الفاظ نہایت سادہ اور عبارت سلیس اور سہل ممتنع ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ تینوں قسم کے مضامین اور ان کے مناسب الفاظ اور ان کے مطابق طرز بیان سب موجود ہے۔ اور ہر قسم کا مضمون جس طرح پر بیان ہوا ہے وہ بے مثل اور بے نظیر عبارت میں بیان ہوا ہے۔ پس یہ کہنا کہ کے رسد "تبت یدا" یا "قیل یا ارض ابلعی" نہایت بے سمجھی اور محض سفاہت کی بات ہے۔

بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ میں جو نثریں لکھی گئیں اور جن پر ان کے لکھنے والوں کو مثل مقامات حریری وغیرہ کے فخر ہے۔ وہ قرآن مجید کے سامنے نہایت ہی مبتذل اور نہایت ہی حقیر ہیں۔ اور ہر شخص یقین کر سکتا ہے کہ جو سادگی اور سلاست عرب جاہلیت سے منسوب

ہے۔وہ مطلق اس کلام میں نہیں پائی جاتی اور نہ عرب جاہلیت کے خیالات اس قسم کے تھے جو ان میں ادا کئے گئے ہیں۔

سب سے زیادہ مقدس حدیث کا علم ہے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے وقت میں تو حدیث کی روایت کرنے کی ممانعت تھی۔ خود حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حدیث کی روایت کرنے سے منع کر دیا تھا۔ جو لوگ حدیث کی روایت کرتے تھے۔ ان کی درہ سے خبر لیتے تھے۔ اور ابن مسعودؓ ابودرداء اور ابو مسعود انصاری کو بجرم روایت احادیث قید کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خود حضرت ابو بکرؓ نے جس قدر حدیثیں جمع کی تھیں وہ جلا دی تھیں۔

اگرچہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کثرت سے حدیثوں کی روایت کرنے کا سلسلہ کب سے شروع ہوا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد شروع ہوا ہو گا۔ خود صحابہ رضی اللہ عنہم نے حدیث کی روایت شروع کر دی تھی۔ اور ہم یقین کرتے ہیں کہ صحابہ صرف خالصاً لوجہ اللہ احادیث کی روایت کرتے تھے۔ اس زمانہ میں حدیث کی روائت ایک سے دوسرے کو صرف زبانی تھی۔ مگر جو صحابہ زیادہ حدیثیں بیان کرتے تھے وہ معزز اور مقدس اور بہت بڑے حدیث جاننے والے خیال کئے جاتے تھے۔ اور تمام صحابہ ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ صحابہ کے بعد جو راوی تھے ان کا بھی اعزاز کچھ کم نہ تھا۔ اور جو شخص کوئی حدیث روایت کرتا تھا وہ زیادہ مکرم اور مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اسی تقدس حاصل کرنے کو بہت سے لوگ جھوٹی حدیثوں کی روایت کرنے پر مائل ہوئے اور حدیث کی روایتیں کرنے لگے۔ اور عن فلاں عن فلان یا اخبرنا فلان یا ابناء نا فلان کہہ کر اخیر کو قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیتے تھے۔ چنانچہ علمائے حدیث کو جو آخر کو ہوئے احادیث موضوع کے چھانٹنے میں نہایت مشکلات پیش آئیں اور اس کے پرکھنے اور جانچنے کے لئے متعدد قاعدے بنائے۔

یہ گرما گرمی اور زبانی روایت کرنے والوں کا اعزاز و تقدس اس وقت تک باقی رہا۔ جب کہ زبانی روایت کی کچھ ضرورت باقی نہ رہی۔ اور وہ زمانہ وہ تھا جب علماء محدثین رضی اللہ عنہم اجمعین نے بعد تحقیق و تفحص راویوں کے حال کی حدیث کی کتابیں لکھنی شروع کیں۔ جب حضرت امام مالکؒ نے اپنی موطا لکھ لی تو جو حدیثیں اس میں لکھی گئی تھیں ان حدیثوں کی نسبت کسی راوی کی زبانی روایت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اس طرح جب محمد اسماعیل بخاری نے اپنی کتاب لکھ لی تو ان حدیثوں کی نسبت بھی

کسی راوی کے زبانی روایت کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ رفتہ رفتہ صحاح ستہ بلکہ صحاح سبعہ مرتب ہو گئیں۔ تو زبانی روایت کرنے والوں کی کچھ قدر نہیں رہی یعنی ان کی ڈیمانڈ نہیں رہی۔ اور زبانی روایت بالکل زوال پذیر ہو گئی۔

اب تمام دارومدار علم حدیث کا ان کتابوں پر رہ گیا جو صحاح کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر اس وقت بھی راویوں کے حالات بیان کرنے کی ضرورت تھی۔ اور ان کے حالات کا بیان کرنا صرف زبانی بیان پر منحصر تھا۔ یہاں تک کہ اسماء رجال کی کتابیں مرتب ہو گئیں۔ اور اس وقت راویوں کے حال کی جو روایت زبانی بیان کی جاتی تھی اس کی ڈیمانڈ بھی نہ رہی۔ اور اس کو بھی زوال ہو گیا۔

اب علم حدیث کا اور حدث ہونے کا دارومدار صرف ان کتابوں کے پڑھنے اور جاننے پر رہ گیا جو علم حدیث میں لکھی گئی تھیں۔ ابتدا ابتداء میں تو اسی شخص کی عزت کی جاتی تھی جس نے وہ کتابیں ایسے شخص سے پڑھی ہوں۔ جس نے اپنی قرآت یا سماع کا سلسلہ ان کتابوں کے مصنف تک پہنچا دیا ہو مگر بعد کو یہ قید نہیں رہی۔ بلکہ چند جز حدیث کی کتاب پڑھ لینے کے بعد استاد کل کتاب کی سند دے دیتا ہے۔ مگر ہر زمانہ میں محدیثین نہایت مقدس اور معزز گنے جاتے تھے۔ اور تمام مسلمان کیا امیر کیا فقیر کیا بادشاہ محدیثیں کا نہایت اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ اور جو اوصاف ان میں تھے درحقیقت وہ اسی قابل تھے کہ لوگ ان کا اعزاز و اکرام کریں اور ان کو مقدس جانیں۔ رفتہ رفتہ محدثین کے اوصاف میں بھی کمی ہوتی گئی اسی کے ساتھ ان کے اعزاز اور تقدس میں کمی ہوئی اور اسی کے ساتھ علم حدیث کا بھی تنزل شروع ہوا۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ علمائے علم حدیث اس تقدس و اعزاز و اکرام حاصل کرنے کے ارادہ سے حدیث کے سیکھنے میں مشغول رہتے تھے غالباً ان کی نیت خالصتاً للہ ہو گی مگر اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ اس سبب سے ان کو فتوحات سلاطین کی طرف سے اور عام لوگوں کی طرف سے اس قدر پہنچتی تھیں، جو ان کی حاجت اور ضرورت سے بہت زیادہ تھیں مگر رفتہ رفتہ اس میں بھی زوال آ گیا اور اسی کے ساتھ علم حدیث کو بھی زوال آ گیا۔

اس زمانہ میں حدیث کی کتابوں کی شرحیں ایسی مفصل لکھی ہوئی موجود ہیں جن میں ہر ایک امر کی نسبت پوری بحث ہے۔ اور اسماء رجال کی متعدد کتابیں نہایت مبسوط موجود ہیں۔

اس لئے کسی شخص کو جو عربی جانتا ہے کسی استاد سے حدیث پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ جو کچھ وہ ان کتابوں میں دیکھ کر پاتا ہے استاد بھی اتنا یا اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا۔ اور یہی وجہ ہوئی ہے کہ حدیث کی پوری کتابیں پڑھنے کی اب رسم نہیں رہی بلکہ صرف تبرکاً کوئی حدیث کی کتاب کسی استاد سے شروع کی جاتی ہے اور چند جزو پڑھنے کے بعد استاد اس کتاب کی سند دے دیتا ہے شاذ و نادر ہی طالب علم ہوں گے جو استاد سے حدیث کی پوری کتاب پڑھتے ہوں گے۔

حدیث کے بعد مقدس علم فقہ کا ہے۔ آئمہ مجتہدین کے زمانہ سے پہلے ہر ایک شخص حدیث پر جو اس کو پہنچی تھی۔ یا تعامل پر عمل کرتا تھا۔ اس زمانہ کے بعد ان حدیثوں پر جو کتابوں میں لکھی گئی تھیں۔ اور جو مطلب ان کا وہ سمجھتا تھا یا جس کو عالم اور مقدس سمجھتا تھا اس کی سمجھ پر عمل کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ فقہ اور اصول فقہ کی کتابیں مرتب ہوئیں۔ اور اہل سنت و جماعت میں چار امام مقبول ہوئے اور جو امام جس شہر یا نواح شہر میں تھا وہاں کے لوگ یا جو اس کے شاگرد تھے اسی کی رائے پر چلتے تھے۔ رفتہ رفتہ تقلید کا زور ہوا۔ اہل علم نے قرآن و حدیث پر غور کرنا اور اس سے مسائل کا استخراج کرنا چھوڑ دیا۔ اور جو کچھ آئمہ مجتہدین نے کہا اسی پر اکتفا کیا اس سبب سے ان لوگوں میں سے مادہ اجتہاد کا زوال ہو گیا۔

ابتدا ابتدا میں ایسے لوگ بھی تھے جو مرجحین فی الروایت کے لقب سے مشہور تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فلاں حکم کہاں سے استنباط کیا گیا ہے اور کتاب و سنت سے اس کی کیا دلیل ہے۔ اور فلاں حکم کہاں سے لیا گیا ہے۔ اور کتاب و سنت سے اس کی کیا دلیل ہے۔ اور جس کو قوی سمجھتے تھے اس کو اختیار کرتے تھے مگر جب فقہ کی کتابیں زیادہ مبسوط تصنیف ہو گئیں جن میں ہر ایک امر کی تفصیل تھی تو مرجحین فی الروایت کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اور اس میں بھی زوال آگیا اب صرف روایات جزئیہ پر جو کتب فقہ اور فتاووں میں مندرج ہیں۔ دارومدار قضا اور افتا کا رہ گیا ہے ان قاضیوں اور مفتیوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ حکم کہاں سے اور کیوں کر اور کس وجہ سے استنباط ہوا ہے بڑا فقیہ وہ ہے جو ہر ایک جزئی روایت کو کسی فتاوے سے نکال دے۔

اس زمانہ میں ایک فرقہ ہے جو اپنے تئیں اہل حدیث کہتا ہے اور اس کے مخالف اس کو وہابی کہتے ہیں۔ وہ فرقہ تقلید کا منکر ہے اور عمل بالحدیث کا قائل ہے۔ مگر وہ بھی تقلید میں

پھنسا ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس نے احادیث مجتمعہ میں روایت کو چھوڑ دیا ہے بلکہ اس کو حرام سمجھتا ہے اور حدیثوں کی نسبت اگلے لوگ جو لکھ گئے ہیں اس کی تقلید کرتا ہے اور جس قدر لوگوں کے مقلدین آئمہ مجتہدین تقلید کرتے ہیں اس سے بہت زیادہ لوگوں اور راویوں کی یہ فرقہ تقلید کرتا ہے اس بیان سے ظاہر ہے کہ جس چیز کی ڈیمانڈ تھی اسی کی سپلائی تھی جب ڈیمانڈ نہ رہی تو سپلائی بھی نہ رہی۔

اس کے بعد فلسفہ ہے۔ جس کے جاننے پر چند علمائے اسلام بہت فخر و ناز کرتے تھے۔ مگر بعض علماء اسلام نے تو اس کا پڑھنا حرام بتلایا ہے۔ اور بعض نے منطق کو بھی جزو فلسفہ سمجھ کر اس کے پڑھنے کو بھی حرام ٹھہرایا ہے۔

یہ فلسفہ جو اب تک ہمارے پاس ہے دراصل یونانیوں سے جو بت پرست تھے۔ لیا گیا ہے۔ اس کا موضوع زیادہ تر انجانی چیزوں پر بحث کرنی ہے اور بہت سا حصہ اس کا خیالی امور پر بحث کرنے سے متعلق ہے۔ اس لئے یہ بھی بطور ایک مشغلہ کے سمجھے جانے کا مستحق ہے کیونکہ اس سے کوئی امر محقق حاصل نہیں ہوتا ہیولے اور صورت اور جزو لا یتجزی کی بحث میں عمر صرف ہو جاتی ہے۔

اس فلسفہ کے مقابلہ کے علماء اسلام نے علم کلام ایجاد کیا تھا۔ تاکہ اسلام کو اس کے صدمہ سے بچاویں۔ اس لئے چند مسائل فلسفہ کے علم کلام میں داخل ہو گئے تھے۔ مگر بہت ہی کم۔ اور شاید کوئی بھی نہیں۔ علمائے مذہب ایسے ہوئے ہیں جن کو اس فلسفہ میں کافی دستگاہ حاصل ہوئی ہو۔ اور اس لئے ضروری تھا کہ اس فلسفہ کو روز بروز تنزل ہوتا جاوے کیونکہ اس کی ڈیمانڈ نہیں تھی یا بہت ہی کم تھی۔

علم ادب کا عروج یا تو سلاطین کی قدر کے سبب سے تھا یا اس سبب سے تھا کہ اسی زبان کے ذریعہ سے مذہبی کتابیں پڑھی جاتی تھیں۔ ایسے لوگ تو بہت کم گذرے ہیں جنہوں نے عربی زبان کو علوم عربیہ اور علوم مذہبیہ کو صرف خالصاً للہ پڑھا ہو۔ بلکہ وہ علم جو ذریعہ حصول معاش کے بھی تھے۔ اور عہدہ قضا اور افتا اور تولیت اور محتسب اور دبیر و وزیر اور دیگر عہدہ ہائے دفاتر سلطنت ہائے اسلامیہ ان کے پڑھنے سے حاصل ہوتے تھے۔ اور نیز اعزاز و تقدس اور قبولیت عام انہی علوم کے پڑھنے سے ہوتی تھی۔ اور نیز فتوح سلاطین اور نذر و نیاز عوام انہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتی تھی۔ اس لئے کثرت سے لوگ ان علوم کے پڑھنے پر متوجہ

تھے جب کہ ان کی ڈیمانڈ نہ رہی۔ تو ان کی بہتات بھی نہ رہی۔ تعجب ہے کہ اگلے زمانہ میں فقرا اور صوفی اور صاحبان سجادہ و خانقاہ بہت کثرت سے موجود تھے۔ مگر اس زمانہ میں وہ بھی نایاب ہیں۔ اور اگر کہیں کچھ اس کے مدعی پائے جاتے ہیں۔ وہ اگلے لوگوں کی خاک پا کے برابر بھی نہیں ہیں۔ اس کا سبب کچھ ہی ہو۔ مگر یہ کلیہ کہ جس قدر ڈیمانڈ ہوتی ہے اسی قدر سپلائی بھی ہوتی ہے۔ ان پر بھی صادق آتا ہے۔

اگلے زمانہ میں بہت بڑی مشکل یہ تھی کہ اگر کوئی عالم کسی مسئلہ میں کوئی بات جو مذاہب مروجہ کے خلاف تھی تحقیق کرتا تھا۔ تو اس کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگر ظاہر ہو جاتی تھی تو قتل و قید سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ اور اس لئے تحقیقات مسائل مذہبی بالکل بند ہو گئی تھی۔ امام غزالی نے اس میں کسی قدر جرائت کی اور چھوٹے چھوٹے رسالے۔ "المضنون علی غیر اہلہ۔" اور "المضنون علے اہلہ" اور "التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" لکھے۔ ان کی قسمت اچھی تھی کہ ملک شاہ سلجوقی کے چنگل سے بچ گئے۔ ورنہ قتل ہونے میں کچھ باقی نہ تھا۔ ان کی کتاب "احیاء العلوم" جو نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس میں بھی کچھ شائبہ تحقیق جدید کا پایا جاتا ہے۔ اس کے بھی جلانے اور معدوم کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہمارے قریب زمانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ہوئے جو محدث بھی کہلاتے تھے۔ مگر ان کے خیالات و اقوال بھی کسی قدر تحقیقات جدید پر مائل تھے ان کی قدر بھی نہ اس زمانہ میں ہوئی جب وہ زندہ تھے۔ اور نہ اس زمانہ میں لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر ہے۔ باوجودیکہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس اخیر زمانہ میں مثل ان کے کوئی دوسرا عالم نہیں ہوا۔

اس زمانہ میں ہر ایک کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کو کوئی امر مانع نہیں ہے۔ مگر اب نہ پہلے سے عالم ہیں۔ اور جو ہیں کیا مقلد اور کیا اہل حدیث سب تقلید کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور ان میں مادہ اجتہاد و تحقیق معدوم ہو گیا ہے۔ پس ہر ایک اپنی لکیر پر فقیر ہے۔ اور کولھو کے بیل کی مانند اسی حلقہ میں چکر کھاتا جاتا ہے۔ جس حلقہ میں اس کو آنکھ بند کر کے ہانکا تھا۔

اس زمانہ میں ایک مقدس گروہ علوم عربیہ کے زندہ کرنے اور رونق دینے پر آمادہ ہے۔ ہم بھی خدا سے چاہتے ہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ بموجب اس قاعدہ کلیہ کے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ بغیر ڈیمانڈ کے سپلائی نہیں ہو سکتی۔

اگلے زمانہ میں جو علوم عربیہ کو رونق تھی وہ سلاطین کے انعامات۔ جاگیرات امرا کے صلات۔ اور عوام کے نذرات۔ حصول معاش کے ذرائع اور تقدس حاصل ہونے کے سبب سے تھی۔ اور یہی امور ان کے لئے ڈیمانڈ تھی۔ مگر اب یہ ڈیمانڈ نہ رہی۔ اس کی سپلائی کیونکر ہو سکتی ہے۔ باقی رہا خالصتاً للہ۔ اور بہ نیت ثواب بلا خیال تقدس کسی علم کو یا علم دین کو حاصل کرنا۔ یہ تو شاید کسی کا مقصد ہو۔ کیونکہ نیک آدمیوں سے دنیا خالی نہیں ہے۔ مگر کروڑوں مسلمانوں کا جو دنیا میں بستے ہیں یہی ایک مقصد نہیں ہو سکتا۔ وللہ در من قال۔

شب کہ عقد نماز بر بندم

چہ خورد و با مداد فرزندم

ہاں یہ بات دوسری ہے کہ کوئی نماز پڑھ کر یا پڑھا کر پیٹ بھرے۔ کوئی وعظ کہہ کر پیٹ پالے۔ کوئی حدیث فقہ پڑھا کر معاش حاصل کرے۔ کوئی فقیر اور مشائخ اور سجادہ نشین ہو کر زندگی بسر کرے۔

اس زمانہ میں مدارس علوم عربیہ اس کثرت سے ہیں کہ پہلے زمانہ میں نہ تھے۔ مگر چونکہ ان کا ڈیمانڈ نہیں ہے۔ سب کے سب خستہ حالت میں ہیں۔ اور لوگوں کو برباد کرتے جاتے ہیں اور آخر کو خود بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ قلیل مسلمانوں کا ہے جو علوم زبان انگریزی کی تحصیل میں مشغول ہے۔ ان پر بے انتہا جھوٹی جھوٹی تہمتیں لگائی جاتی ہیں اور ان جھوٹی تہمتوں کا لگانا بڑی دینداری سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ ادھر ادھر دونوں طرف ملے جلے ہیں ان سے ان کے قدیم یار کہتے ہیں "آمنو کما آمن الناس" تو وہ جواب دیتے ہیں "انؤمن کما آمن السفہاء" اور خدا کہتا ہے "الا انھم ھم السفہاء" اس پر ہمارے انگریزی خواں طالب علم کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ جس چیز کا پہلے زمانہ میں ڈیمانڈ تھا۔ اس کو پہلے لوگ حاصل کرتے تھے۔ جس چیز کی اس زمانہ میں ڈیمانڈ ہے اس کو ہم حاصل کرتے ہیں۔ پس ہم میں اور پہلوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔

ان انگریزی خواں لوگوں میں جو لوگ کچھ زیادہ جان گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان علوم کو جو عربی میں ہیں کیوں پڑھیں۔ جب کہ تمام علوم جو اس میں تھے بہت زیادہ اور اعلےٰ درجہ پر ترقی کر گئے ہیں۔ اور اس میں بہت سے علم ایسے ہیں۔ جو محض غلط اور خیال خام پر مبنی تھے۔ اور جن کی غلطیاں علانیہ ظاہر ہو گئی ہیں۔ اور بہت سے علوم جدید تحقیق ہو گئے ہیں۔

پس اگر ہم علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو ترقی یافتہ علوم قدیم اور تحقیقات شدہ علوم جدیدؔ کو کیوں نہ حاصل کریں۔

بعض علما ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ ارے کم بختو علوم دین کو تو پڑھو۔ تو وہ ان عالموں کو جواب دیتے ہیں کہ علوم دین سے اگر تمہارے نزدیک ہماری کنارہ کشی ہے۔ تو اس کا عذاب اور گناہ تمہارے سر پر ہے۔ کیونکہ کتب قدیمہ مذہبی میں تم سے بزرگوں نے ایسے امور شامل کردیئے ہیں جن کا غلط ہونا ثابت ہوگیا ہے۔ خدا اور رسول نے ان کو شامل نہیں کیا۔ بلکہ علما نے اپنے غلطی سے ان کو مذہب میں شامل کردیا ہے۔ اور تم ان کی تنقیح نہیں کرتے۔ علاوہ اس کے علوم جدیدہ سے جو بعض مشکلات امور مذہبی میں پیش آتی ہیں ان کو تم حل نہیں کرتے۔ اور علوم جدیدہ کے مقابلے کے لئے کوئی جدید علم کلام نہیں بناتے جیسا کہ تمہارے پیشواؤں نے یونانی فلسفہ کے لئے بنایا تھا۔ پس جو کچھ اس میں گناہ ہے۔ وہ تمہارے سر پر ہے۔ مگر برائے خدا ایسا علم کلام نہ بنانا کہ الٹی ہنسی ہو۔

بہت سے بزرگ انگریزی خواں لوگوں کو بد عقیدہ یا ملحد و دہریہ کہتے ہیں شاید ایسا کوئی ہو جس سے میں واقف نہیں ہوں۔ مگر ایسے لوگوں سے واقف ہوں جو ایک حرف انگریزی کا نہیں جانتے وہ بھی بد عقیدہ ہیں۔ اور اگر میں مذہب اسلام کا ایک وسیع دائرہ میں ہونا تسلیم نہ کرتا تو ان کو اسلام کے دائرہ سے خارج کردیتا۔

انگریزی خوانوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ نیچری خیال رکھتے ہیں۔ اور نماز روزہ کے پابند اور احکام مذہبی میں چست نہیں ہیں اور عقاید مذہبی سے ناواقف محض ہیں۔ یہ کہنا کسی قدر صحیح ہے۔ مگر انگریزی مدرسوں اور مشنریوں کے مدرسوں کی نسبت یہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ یورپ کے مدرسوں میں علاوہ پروفیسروں کے ایک شخص طالب علموں کے مذہب کی نگہبانی کے لئے مقرر ہوتا ہے جو ڈین کہلاتا ہے۔ ہم نے بھی اپنے کالج میں طالب علموں کی مذہبی حفاظت کے لئے ایک نہایت لائق عالم مقرر کیا ہے۔ جس کی نصیحت سے طالب علموں کو بہت فائدہ ہے۔ تمام طالب علم جماعت کے نماز پڑھتے ہیں۔ مختصر کتابیں مقائد مذہبی کی ان کو پڑھائی جاتی ہیں۔ اسلام کی مختصر تاریخ ان کے درس میں شامل ہے۔ جنہوں نے عربی زبان بطور سیکنڈ لنگویج کے لی ہے ان کو عربی میں اور جنہوں نے فارسی سیکنڈ لنگویج لی ہے۔ ان کو فارسی میں اور چھوٹے لڑکوں کو نماز کی کتابیں اردو میں پڑھائی جاتی ہیں۔ پس ہمارے کالج کی

نسبت یہ کہنا کہ انگریزی خواں طالب علموں کو عقائد مذہبی سے لاعلمی ہوتی ہے محض غلط ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے کالج کے طالب علم جس قدر نماز روزہ کے پابند ہیں شاید بہت کم گھرانے ایسے نکلیں گے جن کے لڑکے اس قدر نماز روزہ کے پابند ہوں۔

احکام مذہبی میں چست نہ ہونے کی نسبت ہم پوچھتے ہیں کہ کونسا خاندان ہے جس کے لڑکے انگریزی نہیں پڑھتے اور وہ احکام مذہبی میں چست ہیں۔ یا زمانہ سابق میں کوئی خاندان تھا جس کے لڑکے احکام مذہبی میں چست تھے۔ لڑکوں کو جانے دو ہم بڑوں کی نسبت پوچھتے ہیں کہ سوائے اشخاص خاص کے کس قدر ہیں جو احکام مذہبی میں چست ہیں۔ جس طرح زمانہ کے مسلمانوں کا حال ہے ہماری دانست میں ہمارے کالج طالب علموں کا اس سے بہتر حال ہے۔ کہنے والوں کو اختیار ہے جو چاہیں سو کہیں۔

بعض علماء مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ نئی روشنی والوں یعنی انگریزی خوانوں اور ان کے حامیوں کو آگے بڑھتے جانے دو۔ اگر تم دینی تمدنی ترقی چاہتے ہو۔ تو پیچھے ہٹو۔ اور پچھلے لوگوں سے ملو۔ اور یہاں تک پیچھے ہٹو کہ ہٹتے ہٹتے صحابہ اور نبی آخر الزمان سے جا ملو۔ اے حضرت پیچھے ہٹنا تو آسان ہے۔ مگر صحابہ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک جا ملنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے مجھ کو خوف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ پیچھے ہٹتے ہٹتے گڑھے میں جا پڑو۔ "لانکم علیٰ شفا حفرۃ" پھر ہم عاجزی سے کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانہ تک پہنچنا تو دشوار ہے۔ مگر برائے خدا پیچھے ہٹنے کی نصیحت نہ فرمائیے۔ جس جگہ مسلمان تھے اسی جگہ ٹھیرے رہنے نے تو مسلمانوں کو اور مسلمانی سلطنتوں کو برباد قوم اسلام کو ذلیل اور خوار کر دیا۔ دنیا میں جہاں مسلمان ہیں سب ایک حالت میں ہیں۔ پھر اب ان کو پیچھے ہٹا کر کیا کیجئے گا۔ کیا ان کو معدوم کر دینے کا ارادہ ہے۔ خدا نہ کرے۔ بقول ایک بزرگ کے مسلمان عالموں نے اپنے تعصب بے جا یا نادانی اور بے سمجھی اور جھوٹی دینداری اور جھوٹی ترک دنیا کی نصیحت کرتے کرتے تو مسلمانوں کو لنگوٹی بندھوا دی اب کیا آپ کا ارادہ اس لنگوٹی کے بھی کھلوا لینے کا ہے۔

اب ہم مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں۔ اور بلا خوف لومۃ لائم بلند آواز سے کہتے ہیں کہ مذہب اسلام کی شان نہایت ارفع ہے۔ اور دنیوی جاہ و تمکنت۔ دولت و عزت کے حاصل کرنے سے اور اس میں ترقی کرنے سے اس میں کوئی خلل نہیں آتا۔ اسلام کی عزت۔ اسلام

کی شان و شوکت خود مسلمانوں کی عزت۔ اور مسلمانوں کی شان و شوکت سے ہے وہ علیحدہ بت نہیں ہے۔ جسکی پرستش مسلمانوں سے علیحدہ ایک مندر میں یا کعبہ کی چار دیواری میں کی جائے۔ تاریخ اسلام کی ورق گردانی کرو۔ اور دیکھو کہ جب کبھی مسلمانوں نے علوم مذہبی کے ساتھ علوم دنیوی میں ترقی کی اور دنیا میں دولت اور عزت شان و شوکت حاصل کی وہی زمانہ اسلام کی ترقی اور جاہ و جلال اور عزت و شوکت کا سمجھا جاتا ہے۔ جو علما (اور وہ غالبا حنفی علما ہیں) نصیحت کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے اور علوم جدیدہ میں ترقی کرنے سے مسلمانوں کے ایمان میں خلل آتا ہے۔ ان کو یاد رکھنا چاہئے اور نہیں بھولنا چاہئے کہ "الایمان لایزید ولا ینقص" اور ان کو سوچنا چاہئے۔ اور نہایت راستبازی سے کہنا چاہئے کہ اسلام میں اور دنیوی عزت حاصل کرنے میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ اور اب بجائے اس کے کہ وہ پکارتے ہیں کہ زمانہ کے رخ کے برخلاف حرکت کرو۔ مسلمانوں کو یہ سچی نصیحت کرنی چاہئے کہ "درمع الدھر کیف مادار" وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْم۔

سورج کی گردش زمین کے گرد قرآن مجید سے ثابت نہیں

لوگوں کا یہ خیال کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نمرود کے سامنے یہ حجت پیش کرنی۔ کہ "ان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب" اس بات پر دلیل قطعی ہے کہ آفتاب زمین کے گرد پھرتا ہے۔ تمام بزرگان قدیم کیا عرب عربا۔ اور کیا صحابہ کرام۔ اور کیا علمائے اسلام اسی پر یقین کرتے تھے۔ پس یہ کہنا کہ آفتاب ساکن ہے۔ اور زمین اپنے محور پر یومیہ ملیلیتہ کی حرکت کرتی تھی۔ جس کے سبب دن رات اور طلوع و غروب ہوتا ہے قرآن مجید کے برخلاف ہے۔

مگر ہمارے نزدیک ایسا کہنا خود قرآن مجید کا مطلب اور اس کا طرز کلام نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔ قرآن مجید میں صرف یہ بیان ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ کہ خدا سورج کو مشرق سے لاتا ہے۔ پھر اگر تجھ میں کچھ طاقت ہے تو اس کو مغرب سے لا۔ اور یہ نہیں بتایا۔ کہ کس طرح پر خدا اس کو مشرق سے لاتا ہے۔ خود اس کی حرکت سے یا اور کسی چیز یا زمین کی حرکت سے۔ پس یہ کہنا۔ کہ یہ آیت سورج کی گردش کی قطعی دلیل ہے محض تقدیر ہے۔

اس بات پر عرب عربا۔ یا صحابہ کرام یا علمائے اسلام یا تمام انسانوں کا یقین کرنا۔ کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ اور مغرب کو جاتا ہے۔ مشاہدہ پر مبنی ہے۔ کیونکہ وہ اس طرح پر دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ بیان کرنی پیغمبر کا کام نہیں تھا۔ اور نہ ان لوگوں کے لئے ضروری تھا۔ جو اسی طرح پر سورج کا نکلنا اور غروب ہونا دیکھتے تھے۔ بلکہ یہ کام علمائے علم ہیئت کا کام تھا۔ اور ان علماء نے سورج کا زمین کے گرد پھرنا جیسا کہ وہ دیکھتے تھے۔ بغیر تجربہ کے اور بغیر تحقیقات کافی کے غلطی سے قرار دیا تھا۔ اور یہی امر تمام قدما کے دل میں خواہ وہ عرب عربا ہوں یا صحابہ کرام اور علمائے اسلام مستقر ہو گیا تھا۔ مگر اب تحقیقات علوم جدید سے اس امر کی غلطی ثابت ہوئی ہے۔

اصلی مقصود اس آیت کا خدا کی کامل قدرت اور خدا کی بے انتہا عظمت کا ثابت کرنا ہے۔ نہ سورج کے اس طرح پر دکھائی دینے کے سبب کا پس اگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور علمائے اسلام نے اس کا سبب غلط سمجھا۔ خواہ اپنے اجتہاد سے۔ خواہ مشاہدہ سے۔ جیسا کہ

اُن کو دکھائی دیتا تھا۔ تو ان کی بزرگی اور تقدس میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ کیونکہ وہ خدا کے بندے۔ اور خدا کی عبادت کرنے والے تھے۔ نہ علم ہیئت کے دقیق مسائل کو حل کرنے والے۔ اور جو مقصود اس آیت کا تھا۔ اس غلط فہمی سے اس میں کچھ نقصان نہیں آتا ہے۔ اور ہمارے نازدیک یہی بڑا معجزہ قرآن مجید کا ہے۔ کہ جاہل اور عالم دونوں کی برابر ہدایت کرتا ہے۔ جو ہدایت کہ قرآن مجید کا مقصود ہے۔

سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن مجید کو اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ان امور سے جو لوگوں کے دلوں میں منقش تھے یا ان رسوم سے جو ایام جاہلیت میں مروج تھیں۔ بشرطیکہ مخالف اس مقصد کے نہ ہوں۔ جس کے لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے۔ کچھ بحث یا تعرض نہیں تھا۔ اور اسی لئے اسی طرح ان کو چھوڑ دیا۔ جس طرح پر کہ وہ تھے۔ اور قرآن مجید میں بطور نقل یا بطور مسلمات ان لوگوں کے (جن کو فہمائش کی جاتی ہے۔ اور جس پر حجت الزامی کی بنا قائم ہوتی ہے) بیان کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ ان امور کی حقیقت بھی اسی طرح پر ہے۔ جس طرح پر کہ وہ نقل کی گئی ہے۔

اس قسم کے امور پر بحث نہ کرنا۔ نہایت مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ان امور سے بحث بھی کی جاوے۔ تو لوگ ایک نئی بحث اور فکر میں پڑ جاوینگے۔ اور جس امر کی ہدایت اصلی مقصود ہے۔ وہ ضائع ہو جاویگی۔ مثلاً اسی مقام پر جو حضرت ابراہیم نے اپنی حجت میں بیان کیا ان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فأت بها من المغرب" اگر اس کے عوض اس طرح وہ بیان کرتے کہ "ان اللہ یدو الارض من المغرب الی المشرق۔ فدور الارض من المشرق الی المغرب" تو کوئی شخص اس کا مطلب نہ سمجھتا۔ بلکہ سب لوگ حیران ہو جاتے۔ کہ زمین کے پھرنے کے کیا معنی ہیں۔ اور اگر زمین پھرتی ہے۔ تو ہم ٹیڑھے کیوں نہیں ہو جاتے۔ اور اس کا پھرنا ہم کو معلوم کیوں نہیں ہوتا۔ اور جب ہم اس کے نیچے جاتے ہیں۔ تو گر کیوں نہیں پڑتے۔

اول تو یہ سب امور جب تک کہ علم رفتہ رفتہ اعلیٰ ترقی پر نہ پہنچے۔ معلوم بھی نہیں ہو سکتے۔ اور پھر ان کا سمجھانا نہایت ہی مشکل پڑتا ہے۔ باوجودیکہ علوم اس زمانہ میں ایسی ترقی پر پہنچ گئے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ اب بھی ان امور کے سمجھنے میں ان کی عقل عاجز ہے۔ پس قرآن اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ان جھگڑوں میں پڑنا۔ اس مقصود کا برباد کر دینا تھا۔ جس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے۔ اور اس لئے ضروری

تھا۔ کہ جو مسلمات اور رسومات ایسی ہیں جن سے اس اصلی مقصود ہدایت میں کچھ نقصان لازم نہیں آتا۔ ان کو نہ چھیڑا جاوے اور خلق موجودات کے باریک باریک نکتوں کے سمجھانے پر متوجہ ہونا۔ جس کو ترقی علم اپنے وقت پر بخوبی سمجھا سکتی تھی۔ محض غیر ضروری تھا۔

ہم بھی کبھی اسی رنگ میں تھے

ہمارے پاس جناب فرخندہ علی صاحب نے مقام حیدر آباد سے ایک تحریر بھیجی ہے جو اس تحریر کا جواب ہے۔ جو جناب شمس العلماء شیخ محمود گیلانی نے اس باب میں تحریر فرمائی ہے۔ کہ قرآن مجید کی بعض آیتوں سے زمین کا متحرک ہونا پایا جاتا ہے۔

جناب سید فرخندہ علی صاحب قرآن مجید کی بعض آیات کے استدلال سے زمین کا ساکن ہونا۔ اور آفتاب کا زمین کے گرد متحرک ہونا ثابت فرماتے ہیں۔ اس پر کہتے ہیں۔ کہ ہم بھی کبھی اسی رنگ میں تھے۔ بہت مدت ہوئی۔ کہ ہم نے ایک رسالہ لکھا تھا۔ جس کا نام ہے۔ "قول متین فی ابطال حرکتِ زمین۔" اور فخر کرتے تھے۔ کہ نہایت خوبی سے ہم نے حرکت زمین کا ابطال کیا ہے مگر جب غور کیا تو سمجھے۔ کہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

اس وقت ہم کو ان دونوں بزرگوں کے دلائل پر جرح وقدح منظور نہیں ہے۔ بلکہ صرف ہم کو یہ کہنا ہے۔ کہ قرآن مجید سے نہ زمین کا متحرک ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔ نہ زمین کا ساکن ہونا۔ اسی طرح نہ آفتاب کا متحرک ہونا ثابت ہو سکتا ہے اور نہ ساکن ہونا۔ اور نہ قرآن مجید کو اس مسئلہ دقیق ریاضی سے بحث کرنی مقصود تھی۔ کیونکہ ترقی علوم خود اس امر کا تصفیہ کرنے والی تھی۔ اور قرآن مجید کا مقصد اس سے زیادہ اعلےٰ اور افضل تھا۔ اور ہرگز مصلحت نہ تھی کہ خدا ایسے باریک مسئلہ کو ان بدوؤں اونٹوں کے چرانے والوں کے سامنے یا ان عالموں کے سامنے جن کے علم و تجربہ نے کافی ترقی نہیں کی تھی۔ بیان کر کے لوگوں کو پریشانی میں ڈالتا۔ اور تعلیم اخلاق کو جو اصلی مقصد مذہب کا تھا۔ ان دقیق مسائل میں ڈال کر برباد کر دیتا۔ بااین ہمہ ہمارا یقین کامل ہے کہ ورک آف گاڈ۔ اور ورڈ آف گاڈ کبھی مختلف نہیں ہو سکتے۔ گو ہم نے اپنے نفس علم سے کبھی ورڈ کے معنی غلط سمجھے ہوں۔ ایک دوست نے ہم سے کہا۔ کہ سورج کی گردش اس کے محوز پر قرآن مجید سے ثابت ہے اور یہ آیت پڑھی۔ والشمس تجری لمستقر لھا ذلک تقدیر العزیز العلیم۔ پس لفظ مستقر لھا سے اس کی حرکت محوری

ثابت ہے کہ اپنی جگہ پر بھی ہے اور حرکت بھی کرتا ہے۔ ہم نے کہا کہ آپ کی جودت ذہن خدا مبارک کرے۔ مگر خدا کو ان مسائل علم ہیات سے بحث نہیں ہے وہ ان امور کو اسی طرح بیان کرتا ہے۔ جس طرح کہ لوگ ان کو دیکھتے ہیں۔ اور اگر آپ کو بھی یہ مسئلہ حرکت شمس کا اپنے محور کے گرد علوم جدیدہ سے معلوم نہ ہوتا۔ تو آپ بھی یہ معنی جو فرماتے ہیں نہ فرماتے۔

ہماری قوم

کیا اس سے آپ کی مراد سادات سے ہے؟ نہیں حضرت ان سے مراد ہے جو کلمہ "لا اللہ الہ اللہ محمد رسول اللہ" پڑھتے ہیں جو ہمارے دادا کی امت اجابت میں داخل ہیں مگر "ہماری قوم" کہہ کر آپ چپ کے ہو رہے نہ اس کا کچھ سر معلوم ہوا۔ نہ پاؤں۔ ہماری قوم سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ حضرت بات یہ ہے کہ کل ہمارے ایک دوست مولانا روم علیہ الرحمتہ کی مثنوی دیکھ رہے تھے۔ اس میں ایک عرب بدو کے کتے کی حکایت تھی اس کو سن کر میرا خیال اپنی قوم پر گیا دل نے کہا کہ ہماری قوم کا بھی یہی حال ہے پھر دل نے کہا کہ نہیں۔ پھر کہا کہ ہاں۔ پھر کہا نہیں۔ پھر کہا ہاں۔ اس کا فیصلہ میں نہ کر سکا۔ اور اس کا خیال اب تک میرے دل میں ہے اور بے ساختہ میری زبان سے نکل جاتا ہے کہ "ہماری قوم" پس جب تمہارے دل کی بھی وہی حالت ہو جو میرے دل کی ہے۔ اور تمہارے دماغ میں بھی وہ سب خیالات جمع ہو جاویں اور سما جاویں جو میرے دماغ میں ہیں۔ تو آپ کو بھی "ہماری قوم" کہے اٹھنے کا مطلب معلوم ہو۔

ہماری قوم سے مطلب یہ ہے کہ ہماری قوم نے اپنے لئے کیا کیا اور کچھ کر سکتی ہے اور کیوں نہیں کرتی۔

یہ تو میں نے مانا کہ آپ کے دل میں جو قومی خیالات ہیں وہ مثل مجذوبوں کے آپ کے منہ سے "ہماری قوم" کا لفظ نکلوا دیتے ہیں مگر بدو عرب کے کتے کی حکایت سن کر بھی کبھی آپ نے کہا ہاں کبھی آپ نے کہا نہ اور اسی تذبذب میں رہے کہ ہاں ٹھیک ہے یا نہ اس کا کیا سبب ہے؟

حضرت بات یہ ہے کہ میں نے اس زمانہ میں اپنی قوم کو نہایت خراب حالت میں دیکھا جن پر ٹھیک یہ مثل صادق آتی ہے کہ۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے

گئے دونوں جہان کے کام سے ہم
نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے

قوم کی اس خراب حالت سے میرا دل دکھا اور میں نے یقین کیا کہ تعلیم اور صرف تعلیم ہی ان کی خراب حالت کے درست کرنے کا علاج ہے۔

میں نے ان کے لئے ایک مدرستہ العلوم بنایا۔ مگر اس کا بننا اور چلنا صرف قوم کی امداد پر منحصر تھا۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ قوم نے اس میں بہت کچھ مدد کی ہے اور قوم ہی کی امداد سے ایسا عالیشان مدرسہ بہت کچھ بن گیا۔ مسجد مدرسہ کی بہت عمدہ و نفیس تیار ہو رہی ہے۔ اور جو کچھ اب تک ہوا ہے۔ وہ قوم ہی کی مدد سے ہوا ہے۔ تو میرے دل سے نا کا لفظ نکلتا ہے۔ مگر جب یہ خیال آتا ہے کہ پورے جوش اور پوری ہمدردی سے جیسی اس کام میں قومی مدد ہونی چاہئے تھی ویسی نہیں ہوئی۔ تو میرے دل سے ہاں کا لفظ نکلتا ہے۔ پھر جب میں سوچتا ہوں کہ پنجاب کے مسلمانوں نے تو دلی ہمدردی کی ہے۔ اور نہایت دلی جوش سے امداد کی ہے اور زندہ دل ان کا خطاب ہو گیا ہے۔ تو یہ خیال بے اختیار میرے دل سے نا نکلواتا ہے۔

پھر جب میں شمال مغربی اضلاع اودھ اور بنگال کا خیال کرتا ہوں۔ جنہوں نے کچھ بھی نہیں یا بہت ہی قلیل اس قومی کام میں مدد کی ہے۔ تو از خود ہاں کا لفظ بصد آہ و نالہ میری زبان پر آتا ہے۔

علیگڑھ کے چند رئیسوں نے دل سے خواہ مقتضائے ریاست امداد کی ہے جن کا میں دل سے شکر گذار ہوں۔ اور اس لئے دل میں آتا ہے کہ بجائے ہاں کے نا کہوں۔

آج صبح کا وقت تھا۔ میں اسی خیال میں بیٹھا ہوا تھا کہ نا کہنا ٹھیک ہے یا ہاں کہ اتنے میں بگی کی گھڑ گھڑ کی آواز آئی۔ نوکر نے کہا کہ حاجی احمد سعید خانصاحب رئیس بھیکم پور ہیں وہ آئے اور پانسو روپیہ نقد امداد کالج کے لئے عنایت فرمائے۔ پھر تو میں نا نا دو دفعہ اور ہاں ایک دفعہ کہنے لگا۔

غرضیکہ مختلف حالات پیش آتے ہیں۔ کبھی نا کہنے کو دل چاہتا ہے۔ اور کبھی ہاں کہنے کو۔ مگر میں تو ہاں ہی کہنے کا تصفیہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں اس قومی کام کے پورا ہونے کا اور قائم رہنے کا کسی میں ولولہ نہیں پاتا۔

خیر یہ تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ نا کا تصفیہ کریں یا ہاں کا۔ مگر جب تک بدو عرب کے کتے کی کہانی نہ معلوم ہو اس وقت تک نہ آپ کی نا کا مطلب سمجھ میں آتا ہے نہ آپ کی ہاں کا۔

حضرت وہ کہانی یہ ہے کہ ایک بدو عرب کا تھا۔ اور ایک کتا اس کے پاس تھا وہ سفر کر رہا

تھا- اور کتا اس کے ساتھ ساتھ تھا- مگر رستہ کے کنارہ پر کتا گر پڑا اور بے حال ہو گیا- دم توڑنے لگا- اور قریب المرگ ہو گیا- بدو اس کے پاس بیٹھا ہوا سر پیٹ رہا تھا- اور زارو قطار رو رہا تھا- اور کہہ رہا تھا کہ میرے رفیق اب تو مجھ سے جدا ہونے کو ہے-

اتنے میں ایک اور مسافر اس راستہ سے گذرا اور بدو کا یہ حال دیکھ کھڑا ہو گیا اور بدو سے کہا کہ تم اس قدر روتے دھوتے کیوں ہو- حال کیا ہے؟ اس نے کتے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ یہ کتا میرا بڑا رفیق ہے- ساری رات میری چوکسی کرتا تھا- اور چوروں کو اور دشمنوں کو میرے پاس آنے نہیں دیتا تھا- دن کو شکار مار لاتا تھا- اور میرے آگے رکھ دیتا تھا- اور نہایت قانع تھا- اور جو لقمہ کہیں سے اس کو مل جاتا تھا وہی کھا لیتا تھا- اور صبر کرتا تھا- اور جو کچھ میں حکم کرتا تھا بجالاتا تھا- اب اس کا یہ حال ہے کہ دم توڑ رہا ہے اور کوئی دم میں مرنے کو ہے-

مسافر نے کہا کہ کیا اس کو شکار کرنے میں کوئی ایسا زخم کسی درندہ جانور کا لگا ہے- جس کے سبب سے اس کا یہ حال ہو گیا ہے- بدو نے کہا نہیں نہیں! کوئی زخم نہیں لگا- مگر چند روز سے اس کو کھانا نہیں ملا اور بھوک کے مارے مر رہا ہے اور اب اس کے مرنے میں کچھ باقی نہیں-

اتنے میں اس مسافر کی نگاہ عرب کے اسباب پر پڑی- اس کی زنبیل میں بہت سا کھانا بھرا ہوا تھا- اس نے کہا کہ تمہارے پاس تو بہت سا کھانا ہے تم نے اس میں سے اس کتے کو کیوں نہیں دیا- بدو نے کہا کہ واہ یہ تو میری زاد راہ ہے- مسافرت میں اس میں سے کھاتا ہوں- اور اپنی زندگی بسر کرتا ہوں- اگر اس میں سے میں اپنے کتے کو دے دوں تو میں کیا کھاؤں-

مسافر نے کہا تم رویا کرو تمہاری قسمت میں رونا ہی لکھا ہے- یہی حال ہماری قوم کا ہے- قوم کے تباہ حال پر روتے اور افسوس تو بہت کرتے ہیں- مگر اسکی امداد کچھ نہیں کرتے- اپنی زنبیل میں بہت کچھ بھرا رکھتے ہیں- مگر کتے کو ٹکڑا نہیں دیتے- اور اس کے بھوکے مرنے پر روتے ہیں-

اسی سبب سے تو میں کبھی اپنی قوم کی نسبت کہتا ہوں- ہاں یعنی اس بدوی کا سا قوم کا حال ہے- اور کبھی کچھ ان کی ہمدردی دیکھ کر کہتا ہوں کہ نا مگر اخیر کو تصفیہ ہاں ہی ہاں کرنا پڑتا ہے- خدا ان کو توفیق دے کہ سب لوگ بقدر اپنی حیثیت بکے کے قوم کی مدد کریں اگر ایسا کریں تو جو خراب حال قوم کا ہے وہ چند روز میں بدل جاوے اور قوم کو قوم کی حالت پر رونا نہ پڑے-

ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط

جس قدر سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و ارتباط ہندو اور مسلمانوں میں ترقی پکڑتا جاوے۔ ہم کو نہایت خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی آریا قومیں بھی خاص ہندوستان کے رہنے والی نہیں ہیں۔ دوسرے ملک سے آکر ہندوستان میں فتمندی کے ساتھ آباد ہوئی ہیں۔ ان کے ہندوستان میں آباد ہونے کو زمانہ کثیر گذر گیا۔ جس کے سبب وہ ہندوستان کے متوطن اور ہندوستان کے رہنے والے ہندو کہلائے۔ مسلمانوں کو بھی ہندوستان میں آئے ہوئے کچھ کم زمانہ نہیں ہوا۔ ان کی بھی متعدد پشتیں ہندوستان ہی کی زمین پر گذری ہیں۔ بہت سے ایسے مسلمان ہیں۔ جن میں آریاؤں کے خون کا بھی میل ہے۔ بہت سے ایسے ہیں۔ جو خالص آریا کہلائے جا سکتے ہیں۔ صدیاں گذر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں۔ ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں۔ ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں۔ پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔ جس طرح آریا قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جا سکتے ہیں۔ ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے۔ اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے۔ کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جاوے گی۔ اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جاویگی۔ ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے۔ بلکہ بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آ گئی ہیں۔ پس جس قدر ان دونوں قوموں میں زیادہ تر محبت زیادہ تر اخلاص زیادہ تر ایک دوسری کی امداد بڑھتی جاوے۔ اور ایک دوسرے کو مثل بھائی کے سمجھیں۔ کیونکہ ہموطن بھائی ہونے میں تو کچھ شبہ نہیں۔ اسی قدر ہم کو خوشی ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں تین باتوں سے اس محبت و اخلاص کا علانیہ ثبوت دیا گیا ہے سب سے اول یہ بات ہے۔ کہ ان دنوں میں سلطان کی یونان پر فتح ہونے کی اکثر جگہ مسلمانوں نے خوشی کی اور مجلسیں آراستہ کیں۔ "شہر میں چراغاں روشن کئے۔" سلطان کو مبارک بادی کے تار بھیجے۔ ہم نے سنا ہے۔ کہ دکن کے ہندوؤں نے بھی اسی طرح خوشی منائی۔ اور سلطان کو مبارک باد کے تار بھیجے جو کافی ثبوت دونوں قوموں میں اخوت کا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے سنا ہے۔ کہ بریلی میں ہندو

مسلمانوں نے نہایت خوبی سے ایک دوسرے کی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ یعنی بقر عید کے روز مسلمانوں نے گائے کی قربانی نہیں کی۔ بلکہ ہندوؤں کی خاطر سے بکرے اور بھیڑوں کی قربانی کی۔ اور ہندوؤں نے بھی اس بات کا خیال اٹھالیا۔ کہ کوئی مسلمان گائے کی قربانی کرتا ہے۔ اور بکرے بھیڑی کی۔ اور ہندوؤں نے محرم کے زمانہ میں سبیلیں لگانے کا اور مسلمانوں کے ساتھ غم میں شریک ہونے کا اقرار کیا ہے۔ ہماری بھی مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم ہو۔ تو گائے کی قربانی نہ کرنا اس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ سول ڈویژن مانک پور گنج ضلع ڈھاکہ میں ایک مسجد بنانے کی ضرورت ہے۔ اور اس مسجد کی تعمیر کے لئے روپیہ جمع کرنا چاہئے۔ اس کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں نے شامل ہو کر کمیٹی بنائی ہے۔ اور ہندو اور مسلمان مل کر اس کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان زیادہ غریب اور زیادہ ذلیل ہیں۔ اس لئے ہندو اس مسجد کی تعمیر کے لئے زیادہ کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اس محبت و ہمدردی اور باہمی بھائی چارہ پر جو ہندوؤں نے ظاہر کیا ہے۔ دونوں قوموں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ ہماری رائے میں جس طرح کہ اختلاف مذہب جیسا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں ہے۔ سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پولیٹیکل امور کا اختلاف بھی سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہے۔ اس زمانہ میں ہندو اور مسلمان دونوں گورنمنٹ انگلشیہ کی رعایا ہیں۔ اور اس کے سایہ عاطفت میں ہر قسم کی خوشی اور امن اور آزادی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ دونوں قوموں کے باہم پولیٹیکل امور میں اختلاف رائے ہے۔ ہندو اس پولیٹیکل پالیسی کے طرفدار ہیں جو کانگرس کے اعلیٰ ممبروں یا اس کے حامیوں اور طرفداروں کی ہے۔ اور جس کا ہر سال مختلف مقامات میں کانگرس کے نام سے اعلان کیا جاتا ہے اور اس پر زور دیا جاتا ہے۔ مسلمان اس پالیسی کے برخلاف ہیں۔ لوگ ان پر اتہام لگاتے ہیں۔ کہ گورنمنٹ کے خوشامدی ہیں۔ لیکن یہ اتہام غلط ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے نزدیک ملک کے انتظام اور امن میں اس پالیسی سے خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اور کسی طرح وہ پالیسی ہندوستان کی حالت کے مناسب نہیں ہے۔ پس اس اتحاد و یکجہتی سے جو اس وقت ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ ظاہر کی ہے۔ اگر یہ مقصود ہو کہ

مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ کانگرس میں اور ان کی پالیسی میں شریک ہو جائیں گے۔ تو ہمارے نزدیک اس مقصد کا حاصل ہونا۔ محالات سے ہے اور ملک کے انتظام اور امن میں نہایت خلل ڈالنے والا ہے۔ گو بعض ناعاقبت اندیش اور امور مملکت سے ناواقف اور ناشدنی باتوں پر یقین کرنے والے مسلمان ہندوؤں کی پالیسی میں شریک اور کانگرس کے جلسوں میں شامل ہو جاویں۔ مگر عموماً مسلمان اس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ بلاشبہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ہم اختلاف مذہب سے قطع نظر کر کے ہندو مسلمانوں میں دوستی و محبت و یگانگت اور آپس میں ہمدردی کا برتاؤ چاہتے ہیں۔ اسی پولیٹیکل اختلاف رائے سے بھی قطع نظر کر کے سوشل امور میں باہم دوستی و محبت و ہمدردی و بھائی بندی کا برتاؤ چاہتے ہیں اور ہم یقین کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں جو غیر معمولی طریقہ پر ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ بھائی بندی و ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایک دھوکا مسلمانوں کو کانگرس میں شامل کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ سچی بھائی بندی۔ سچی ہمدردی اور سچی ہموطنی کا سبب ہے اور ہم خدا سے دعا کرتے ہیں۔ کہ ایسا ہی ہو۔ اور ہم دونوں قوموں میں نہایت محبت و اخلاص سے گورنمنٹ انگلشیہ کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی نہایت وفاداری سے بسر کریں۔ اور ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصر انڈیا کی سلامتی اور درازی سلطنت کی دعا کرتے رہیں۔ جس کی بے نظیر سلطنت کے ساٹھویں سال جلوس کا عنقریب جشن ہونے والا ہے۔

عیسائیوں اور مسلمانوں میں باہمی مودت اور اتحاد

مسلمانوں اور عیسائیوں میں گو اختلاف مذہب ہے مگر اگلے زمانہ میں باہمی عداوت کا ہونا تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں تو خود یہ آیت موجود ہے "۔وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ" یعنی اے پیغمبر تو مسلمانوں کے ساتھ محبت کرنے میں ان کو سب سے زیادہ قریب پائے گا۔ جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ اس لئے کہ ان میں عالم اور درویش ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے (مائدہ۔۸۵)۔

سر ولیم میور اپنی کتاب میں جو خلفاء راشدین کے حال میں لکھی ہے۔ لکھتے ہیں کہ خود رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے مسیحی قبائل سے عہد نامے کئے تھے جن میں آپ نے عیسائیوں کی حفاظت کا اور ان کو ان کے مذہب میں آزاد رہنے کا اور پادریوں کے پرانے حقوق اور اختیارات کے بحال رہنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ علاوہ اس کے عیسائی بھی مسلمانوں کے ساتھ ہر طرح سے معاشرت اور معاونت میں شریک رہتے تھے۔

۱۳ ہجری میں جب جسر کے مقام پر لڑائی ہوئی جس میں مسلمانوں کا سپہ سالار مثنےٰ بن حارثہ تھا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو کچھ دقت پیش آئی تو اس وقت قبیلہ بنی طے کا ایک عیسائی سردار مسلمان سپہ سالار کے پاس آیا اور دریا کے پل کی حفاظت کی تاکہ عرب بسہولت اس پل سے اتر جائیں۔ اور جب کہ دوبارہ فوج کشی ہوئی تو بنی نمر کے قبیلہ کا ایک عیسائی سردار جو رومیوں کی حد میں رہتا تھا۔ کمک کے طور پر لشکر اسلام میں آکر شامل ہوا۔ اور اسی سن میں جب بوہب کی لڑائی ہوئی۔ تو اسی قبیلہ بنی نمر کا عیسائی سردار دشمنوں پر دھاوا کرنے میں مسلمانوں کا شریک ہوا۔ اور مسلمانوں کے سردار اور اس عیسائی سردار نے شامل ہو کر دھاوا کیا اور اسلام کی فتح ہوئی۔ میور صاحب اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں۔ کہ اس معرکہ میں جو شجاعت کے کام ہوئے۔ ان سب میں بڑھ کر ایک مسیحی نوجوان کا کام تھا جو اپنی بدوؤں کی ایک قلیل جماعت لے کر اسلام کے لشکر میں اس وقت داخل ہوا۔ جب کہ خوب گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ ہو کر مخالفوں سے لڑا اور اپنے گھوڑے کو دوڑا کر دشمنوں میں گھس گیا اور مخالف لشکر کے سردار کو قتل کیا اور پھر اپنے گھوڑے کو دوڑا کر مسلمانوں کے لشکر میں پکارتا ہوا داخل ہوا کہ میں بنی تغلب میں سے ہوں۔ اور میں وہ ہوں

جس نے دشمن کے سردار کو قتل کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنو تغلب کی نسبت جو عیسائی تھے حکم دیا کہ ان پر کسی طرح کا دباؤ نہ ڈالا جائے اور وہ اپنے مذہب کی پیروی میں بالکل آزاد ہیں جزیہ جو عیسائیوں سے لیا جاتا تھا بنی تغلب اس کا ادا کرنا اپنے شان کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے درخواست کی کہ ان سے بھی اس طرح پر محصول لیا جاوے۔ جس طرح مسلمانوں سے لیا جاتا ہے اور حضرت عمرؓ نے ان کی درخواست منظور کی۔

سر ہنری لیرڈ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ گر کے قریب جو بحیرہ لوط کے مشرق میں ہے۔ ان کا گذر ایک خیمہ گاہ میں ہوا جو عیسائی عربوں کا تھا اور یہ عیسائی عرب لباس اور آداب معاشرت میں مسلمان عربوں سے کسی بات کا فرق نہ رکھتے تھے۔ مسٹر برخارت جو ایک نہایت نامی عیسائی سیاح ہیں لکھتے ہیں کہ پلماٹرا کے قریب بارہ سو آدمی رہتے ہیں۔ جن میں سے نصف عیسائی ہیں جو اپنے مسلمان ہمسائیوں کے ساتھ نہایت درجہ کے ملاپ سے رہتے ہیں اور مسلمان بدوؤں کا لباس پہنتے ہیں کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں کوئی ظاہراً تمیز نہیں ہو سکتی۔ بنو غسان جو عیسائی ہیں وہ اب تک اپنی عبادات میں عربی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔

ہرقل کی جب شکست ہوئی اور اس کی فوج شہر حمص کے قریب آئی تو شہر والوں نے جو عیسائی تھے۔ فصیل کے دروازے بند کر لئے اور مسلمانوں سے کہا کہ ہم تمہاری حکومت اور تمہارے انصاف کو یونانیوں کی بے انصافی اور ظلم کے مقابلہ میں بہتر جانتے ہیں۔

یہ تو اگلے زمانہ کا حال ہے۔ مگر ہم اس زمانہ میں دیکھتے ہیں کہ جو عیسائی مسلمانی سلطنتوں میں رہتے ہیں ان کے اور ان کے ہمسایہ مسلمانوں میں کسی قسم کی مذہبی عداوت نہیں ہے۔ آپس میں سوشل برتاؤ نہایت خوبی سے ہے۔

عیسائیوں اور مسلمانوں میں مذہبی عداوت ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ مذہب کی رو سے مسلمانوں کو عیسائیوں کے ساتھ ہر قسم کی معاشرت کی کھانے پینے میں ہو یا شادی بیاہ میں سوائے چند جزئی اور خفیف باتوں کے عام طور پر اجازت ہے مسلمانوں کی تاریخ میں سوائے چند متعصب اور ناعاقبت اندیش بادشاہوں مثل متوکل باللہ وغیرہ کے ایسے بادشاہوں کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ جنہوں نے عیسائیوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا ان کے مذہبی رسوم اور مذہبی حقوق میں دست اندازی نہیں کی اور ٹھیک اسی طرح برتاؤ کیا جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں ہوا تھا۔

مذہب اسلام نہایت وسیع مذہب ہے۔ جس میں تحمل اور ادب کا حکم ہے تمام پیغمبر خواہ ان کو یہودی مانتے ہوں یا عیسائی ان سب کو تسلیم کرتا ہے اور ان کی تعظیم کرتا ہے۔ اور ان مذہب کے لوگوں کے ساتھ ٹالریشن کا حکم دیتا ہے بلکہ جب وہ بلند آواز سے پکارتا ہے کہ کوئی ملک اور قوم ایسی نہیں ہے۔ جس میں خدا کے کسی پیغمبر نے اس کی حجت کو پورا نہ کیا ہو۔ تو کون شخص شبہ کر سکتا ہے کہ عیسائیوں کے ساتھ کسی موقع پر بھی مسلمانوں کو سختی کرنے کا صراحتہً یا اشارۃً حکم دیا گیا ہے اور کون شخص ہے جو بعض ظالم مسلمان حکمرانوں کے بیجا متعصبانہ سختیوں کے لئے مسلمانوں کی مذہبی کتابوں سے جواز کا فتویٰ نکال سکتا ہے۔ بلکہ میں پھر کہتا ہوں کہ مذہب اسلام خاص کر عیسائیوں کے ساتھ اور عیسائیوں کے پیغمبر اور بزرگوں کے ساتھ تحمل اور ادب و تعظیم کی تعلیم دیتا ہے۔

سوائے مذہب اسلام کے دنیا میں اور کونسا مذہب ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اور ان کی ہدایات کا ایسا ادب کیا ہو۔ اور ایسی عزت کی ہو جیسی کہ مسلمان کرتے تھے اور کرتے ہیں اور ان کو نبی برحق اور رسول خدا کا مانتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ ہم میں اور عیسائی مذہب میں جو کلمتہ الحق ہے وہ ایک ہی ہے اور اس میں کچھ فرق نہیں کہ خود خدا نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔ "یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمتہ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ"۔ یعنی اے عیسائیو ایک بات پر آ جاؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنے کے۔ پس دنیا میں سوائے اسلام کے اور کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ کو رسول برحق اور مرسل من اللہ مانتا ہو۔ مسلمانوں نے مذہب کی بنا پر جو کچھ عیسائیوں سے چاہا ہے وہ صرف یہی بات ہے کہ ہم اور تم دونوں ملکر ایک خدا کی عبادت کریں۔

خود عیسائی مذہب میں مختلف فرقے ہیں جو مسئلہ تثلیث اور اقانیم ثلاثہ کی نسبت اس امر میں مختلف الرائے والاعتقاد ہیں کہ ان اقنوموں کا ظہور کس طرح سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات مبارک میں ہوا تھا۔ مسلمان بھی یقین کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کلمتہ اللہ ہیں خود قرآن مجید میں خدا نے فرمایا ہے۔ "انما المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ و کلمتہ القاھا الی مریم وروحٌ منہ"۔ یعنی حضرت عیسیٰ خدا کا کلمہ ہے جو مریم میں ڈالا گیا۔ اور اس کی روح ہے۔ بایں ہمہ مسلمان مثل یونیٹیرین کے جو ایک فرقہ عیسائیوں کا ہے۔ لا الہ الا اللہ پر یقین

کرتے ہیں اور حضرت عیسیٰ کو بندہ اور خدا کا رسول جانتے ہیں۔ پس جو اختلاف کہ مسلمانوں کے مذہب کی رو سے ہے۔ وہ ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ خود عیسائی فرقے اس میں مختلف ہیں۔

نہایت نالائق ہیں۔ وہ عیسائی جو مذہب اسلام اور بانی اسلام کی نسبت نعوذباللہ کلمات توہین استعمال کرتے ہیں۔ اور نہایت نالائق ہیں وہ مسلمان جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت یا ان کے اصلی مذہب کی نسبت ایسے ہی کلمات استعمال میں لاتے ہیں۔

مذہب کے رو سے اور اس برتاؤ سے جو اس وقت بھی مسلمان عیسائیوں سے کرتے ہیں۔ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں کوئی مذہبی عداوت نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ عیسائی مسلمانوں کے ساتھ یا مسلمان ازروئے مذہب کے عیسائیوں کے ساتھ مذہبی عداوت رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک محض غلط اور سرتاپا ناواجب ہے۔ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں لڑائیاں ہوئیں اور مخالفتیں بھی پیدا ہوئیں اور عداوتیں بھی ہوئیں۔ مگر ان کی بنا پولیٹیکل امور پر مبنی تھی۔ پولیٹکل امور پر لڑائی جھگڑوں۔ فسادوں اور عداوتوں کا ہونا کچھ غیر مذہب یا غیر قوم پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ پولیٹکل امور ایسے ہوتے ہیں کہ آپس میں ایک قوم اور ایک مذہب کے لوگوں میں لڑائیاں اور عداوتیں ظہور میں آتی ہیں۔ سینکڑوں لڑائیں آپس میں مسلمانوں کی انہیں پولیٹکل امور کے سبب سے ہوئی ہیں۔ اسی طرح باہم عیسائیوں کے اور آپس میں ایک ہی قوم کے انہیں پولیٹکل امور کے سبب سے بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ مگر جب یہ لڑائیاں ایسے لوگوں میں واقع ہوتی ہیں۔ جن کا مذہب بھی مختلف ہوتا ہے تو ان میں مذہبی جوش کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عیسائیوں نے جنگ صلیبی میں جو ایک پولیٹکل یا قومی لڑائی تھی۔ مذہب عیسوی کے جوش کو بھی شامل کر لیا تھا جو صلیبی جہاد کے نام سے مشہور ہے اسی طرح مسلمانوں نے بھی جب دوسرے مذہب والوں سے لڑائی کی تو مذہبی جوش کو اس میں شامل کر لیا۔

۱۸۵۶ء میں ترکوں اور روسیوں سے لڑائی ہوئی تو انگریز اور فرانس سلطان ترکی کے طرف دار ہوئے اور برابر نہایت بہادری اور عمدگی سے سلطان ترکی کے طرف دار ہو کر روسیوں سے لڑے۔ پس یہ تمام کارروائی بجز پولیٹیکل امور کے کسی دوسرے امور پر مبنی تصور نہیں ہو سکتی۔

۱۸۷۶ء میں جب دوبارہ ترکوں اور روسیوں سے لڑائی ہوئی اس وقت فرانس کو وہ شان

وشوکت جو زمانہ بادشاہت میں تھی نہیں رہی تھی- اور ریپبلک کو قائم ہوئے بہت تھوڑا زمانہ گذرا تھا اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ روسیوں کے مقابلہ میں ترکوں کی مدد کرے- انگریزوں نے بھی کسی مصلحت ملکی سے تنہا بلاشمول کسی دوسری سلطنت کے ترکوں کی مدد کرنا اور ان کے ساتھ شامل ہو کر روسیوں سے لڑنا مناسب نہیں سمجھا- اور صرف ترک روسیوں سے لڑتے رہے- اخیر کو انگریز اور سلطنتیں بیچ بچاؤ کرنے کو پڑیں- جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ملک سلطان کے قبضہ سے نکل گئے مگر یہ تمام کارروائی پولیٹکل امور پر مبنی تھی نہ مذہبی عداوت پر-

حال کے زمانہ میں جو آرمینیا والوں نے بغاوت اور شرارت کی اور یونانیوں نے سر اٹھایا جس کی سزا وہ پا رہے ہیں اور خدا نے چاہا تو اپنے کیے کی اور سزا پاوینگے- اس فساد کو مذہبی عداوت پر مبنی کرنا محض غلطی اور سراپا دھوکا ہے بلکہ درحقیقت یہ بھی پولیٹکل امور پر مبنی ہے جس کے سبب سے آرمینیا والوں نے بغاوت کی- اور یونانی جنگ پر آمادہ ہوئے- ہاں ان فسادات کے ساتھ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا آرمینیا والوں اور ان کے مغویوں نے اور یونانی اور ان کے طرف داروں نے مذہبی جوش کو بھی شامل کر لیا- جو محض ایک جھوٹا بہانہ ہے اگر ہم تسلیم کر لیں کہ سلطان کی عملداری میں انتظام نہایت خراب ہے اور آرمینیا والوں نے اس خراب انتظام کے سبب بغاوت کی ہے تب بھی یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی- کہ یہ فساد مذہبی عداوت کے سبب سے نہیں ہوا' بلکہ بدانتظامی کے سبب سے ہوا- اور یہ کہنا کہ سلطان کی عملداری میں عیسائیوں پر ظلم ہوتا ہے ایسا جھوٹ ہے جس سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا عیسائی سلطان ٹرکی کی عملداری میں نہایت مذہبی آزادی سے رہتے ہیں اور جتنی رعائتیں ان کے ساتھ کی جاتی ہیں اتنی رعائتیں مسلمان رعایا کے ساتھ نہیں کی جاتی ہیں- مذہبی آزادی جو ترکوں کی عملداری میں عیسائیوں کو حاصل ہے کسی عملداری میں عیسائیوں کو حاصل نہیں- سلطان ان کے مذہبی مراسم میں مطلق دست اندازی نہیں کرتا- بلکہ ان کی خواہش پر ان کے لئے بشپ یعنی سردار مذہب مقرر کرتا ہے اور جو اعزاز کے درجے سلطنت ترکی میں ہیں وہ سب ان کو عطا فرماتا ہے- خود عیسائی سلطنتوں میں ان عیسائیوں کو جو اس چرچ کے نہیں ہیں- جس چرچ کی سلطنتیں ہیں ایسی مذہبی آزادی نہیں ہے جیسی کہ سلطان کی عملداری میں تمام عیسائیوں کو خواہ کسی چرچ کے ہوں حاصل ہے اس وقت جو لڑائی یونان اور

ٹرکی میں ہو رہی ہے۔ تمام عیسائی سلطنتیں خاموش ہیں اور کسی سلطنت نے یونان کی مدد نہیں کی اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ آخر کو عیسائی سلطنتوں کو جو ترکی کے اردگرد ہیں بیچ بچاؤ کرنے اور صلح کے ہو جانے میں بالاتفاق دست اندازی کرنی پڑے اور معلوم نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو۔ ٹرکی کے مفید یا یونانیوں کے مفید۔ مگر اس سب کی بنا پولیٹکل امور پر مبنی ہوگی نہ مذہبی امور پر۔ پس نہایت افسوس ہے کہ مسلمان یا عیسائی ان ملکی فسادوں کو مذہبی لباس پہنا کر لوگوں کو مشتعل اور برانگیختہ کریں جس سے سراسر ان لوگوں کا نقصان ہے جو ایسی باتوں سے مشتعل ہوں اور ملکی امور کو مذہبی لباس پہنا کر مذہب مذہب پکاریں اور ایسا کرنے سے بجز اس کے کہ ان کی حماقت ثابت ہو اور ہونا کیا ہے؟ بجز اس کے کہ ان کی حماقت سے انہیں کے اہل مذہب کا کچھ نہ کچھ نقصان ہو اور کچھ نتیجہ نہیں اس میں کچھ شک نہیں کہ ٹرکی ایک مسلمانی سلطنت ہے اگر اس کو واجبی خواہ ناواجبی کچھ نقصان پہنچے تو یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ہم مسلمانوں کو نہایت دلی رنج ہو گا۔ اور یہ بات ٹرکی ہی پر موقوف نہیں اگر ایران کی سلطنت کو، مراکو کی سلطنت کو۔ افغانوں کی سلطنت کو انہیں کی نادانی اور حماقت اور بدنظمی سے کچھ پہنچے تو بھی ہم مسلمانوں کو قدرتی رنج ہو گا اور یہی حال تمام قوموں کا ہے کہ اپنی اپنی قومی سلطنت کے زوال یا نقصان سے رنج ہوتا ہے بس اس سے زیادہ ان واقعات کو وقعت دینا اور مذہبی لباس پہنانا محض بیجا اور ناواجب ہے۔ مسلمانوں میں ایک مدت دراز سے بلحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہو گیا ہے بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہو گیا ہے اور "کل مومن اخ" کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے۔ اس لئے وہ ہر ملک کے مسلمان کو اپنی قوم سمجھتے ہیں۔ اور اس کی خوشی سے خوش اور اس کے رنج سے رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور اس لئے ہم کو اگر خدانخواستہ ترکوں کو نقصان پہنچے تو مثل قومی نقصان کے رنج ہو گا۔ گو وہ نقصان کسی پولیٹیکل سبب سے ہی ہو۔

یونانی اور ترک

یونانیوں پر ترکی کی فتح کی خوشی میں مسلمانوں نے حد اعتدال سے باہر قدم رکھا ہے۔ ترکوں کی اس فتح کو اسلام کی فتح سے پکارتے ہیں۔ ہماری دانست میں ایسے امور میں اسلام کو شامل کرنا۔ اور اسلام اسلام پکارنا۔ نہایت نا سمجھی کی بات ہے۔ اسلام کی فتح آج نہیں ہوئی۔ بلکہ اس دن ہوئی۔ جب کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے ہزاروں کافروں اور مشرکوں اور بت پرستوں میں کھڑے ہو کر فرمایا۔ لا الہ الا اللہ۔ کافر کہتے ہی رہے۔ "اجعل الالہتہ الھا واحد ان ھذا الشئی عجائب" یعنی کیا اس نے بہت سے خداؤں کے بدلے ایک ہی خدا ٹھہرایا ہے یہ تو ایک عجیب بات ہے۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے۔ لا الہ الا اللہ۔ خدا نے بھی یہی کہا۔ ان اعبدونی ھذا صراط مستقیم یعنی میری ہی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ پس کسی مسلمان بادشاہ کی فتح یابی کو اسلام کی فتح اسلام کی فتح سے پکارنا اسلام کی قدر و منزلت کو نا سمجھنا ہے۔ فتح اور شکست خدا کی دین ہے جس کو چاہے دے خود خدا فرماتا ہے۔ وتلک الایام ندا ولھا بین الناس یعنی ہم ان دنوں کو لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی مسلمانوں کے غیر مذہب والوں پر فتح ہوتی ہے۔ کبھی غیر مذہب والوں کی مسلمانوں پر۔ جب کہ ترکوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی مدد سے روسیوں پر فتح پائی تھی۔ تو ہم اس فتح کو کس نام سے پکاریں۔ اور جب ترکوں کو روسیوں سے شکست ہوئی۔ تو کیا ہم اس شکست کو اسلام کی شکست سے (نعوذ باللہ) موسوم کریں۔ حاشا وکلا ہمارا مقصد یہ ہے کہ ایسی چیزوں کے ساتھ جو دنیاوی امور اور دنیاوی اسباب پر منحصر ہیں۔ کبھی ادھر ہوتے ہیں کبھی ادھر اسلام کے معزز نام کو جس نے اصلی فتح پائی ہے اور جو ہمیشہ فتحمند رہے گا۔ شامل کرنا کمال نا سمجھی کی بات ہے۔ ہم کو خوش ہونا چاہئے کہ ایک مسلمان سلطنت اس جنگ میں فتح یاب ہوئی اور برباد نہیں ہوئی۔ لیکن اس کو ایک اسلامی لباس پہنانا۔ اور اسلام کی فتح پکارنا۔ اگر حد سے باہر قدم رکھنا نہیں ہے۔ تو اور کیا ہے؟ اور یہ فتح ایسی کونسی فتح ہے۔ جس پر اتنا شور غل مچایا جاوے۔ ہر شخص جانتا تھا۔ کہ ترکوں کے آگے یونانیوں کی کچھ حقیقت نہیں ہے اگر وہ مقابلہ کریں گے۔ تو جس طرح ایک باز چڑیا کو مار لیتا ہے اسی طرح ترک یونانیوں کو مار لیں گے۔ اندیشہ اگر تھا تو یہ تھا۔ کہ یونانیوں کو ترکوں سے مقابلہ کرنے کی جرات کیوں ہوئی۔ ور

اس لئے خیال جاتا تھا کہ درپردہ کوئی بڑی قومی سلطنت یونانیوں کی مدد پر ہے۔ اس شبہ کو مسٹر گلیڈ سٹون کی نامعقول سپیچوں اور تحریروں نے۔ اور لنڈن کے ریڈیکل مجنونوں کی اسپیچوں اور ٹیلی گراموں نے زیادہ قوی کر دیا تھا۔ مگر ہر سمجھ دار سمجھ سکتا تھا۔ کہ نہ مسٹر گلیڈ سٹون گورنمنٹ پر ہیں۔ نہ ان قلیل ریڈیکل ممبران پارلیمنٹ کا گورنمنٹ پر کچھ اثر پڑ سکتا ہے۔ پس یہ خیال کر لینا کہ گورنمنٹ انگریزی کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہے۔ نہایت غلطی اور سفاہت پر مبنی تھی۔ جب لڑائی کا معرکہ گرم ہوا۔ تو کسی بڑی سلطنت نے یونانیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ اور اس سے ظاہر ہو گیا۔ کہ نہ گورنمنٹ انگریزی یونانیوں کی مددگار تھی۔ نہ فرانس۔ نہ جرمن۔ نہ کوئی اور گورنمنٹ۔ اب آئندہ جو کچھ ہو اس کی بناء پولیٹیکل مصلحتوں پر ہو گی۔ نہ اسلام کی مخالفت پر۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جو اس معاملہ میں اس قدر جوش و خروش ہوا۔ ہماری دانست میں صرف انگریزی اخبار اس کا باعث ہوئے ہیں۔ مسٹر گلیڈ سٹون نے اور انگریزی اخباروں نے کوئی درجہ اہانت اور سخت کلامی کا سلطان کی نسبت نہیں چھوڑا تھا۔ اور کوئی بدی اور برائی ایسی نہ تھی۔ جو انہوں نے ترکوں کی نسبت نہ لگائی ہو۔ اور یہ سب باتیں خاص کر ترکوں اور عام طور پر سب مسلمانوں کو رنج دہ اور سخت رنج دہ تھیں۔ مگر جب ترکوں کی فتح ہوئی۔ تو انہوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ ایسا رحم برتا۔ کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جب یونانیوں کے ایک گروہ کے پاس کھانے کو کچھ نہیں رہا۔ تو ترکوں نے اپنے پاس سے ان کو کھانے کو دیا۔ یونانیوں کے مجروحوں کی تیمارداری کی۔ اور نہایت مہربانی سے ان کے ساتھ برتاؤ کیا۔ اب ترکوں کی فتح ہونے کے بعد اس رنج کے مقابلہ میں مسلمانان ہند نے اس فتح کی خوشی میں حد اعتدال سے زیادہ خوشی ظاہر کی۔ اور گورنمنٹ انگریزی نہایت خاموشی سے ان سب باتوں کو دیکھتی رہی۔ ہم بھی اس خوشی کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے۔ مگر یہ بتلاتے ہیں کہ ہم مسلمان ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کی رعایا ہیں۔ اور اس بات کو کبھی بھولنا نہیں چاہئے کہ ہم غیر سلطنتوں کے ساتھ پولیٹیکل امور میں کوئی کام اور کوئی فعل ایسا نہیں کر سکتے۔ جو گورنمنٹ کے برخلاف ہو۔ پس ہم کو لازم ہے۔ کہ ہم وہی کریں۔ جو گورنمنٹ کی مرضی کے برخلاف نہ ہو۔

سلطان اور ہندوستان کے مسلمان

اس عنوان کے نیچے اخبار پایونیر میں ایک تار قسطنطنیہ کا مورخہ ۔ ۱۷جون چھپا ہے۔ جس کا مضمون یہ ہے۔

"جو جواب سلطان نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مبارک بادیوں کا ارسال فرمایا ہے جو انہوں نے یونان پر ٹرکی کی فتوحات کی نسبت سلطان ممدوح کی خدمت میں بھیجی تھیں۔ وہ ایک طولانی چٹھی میں درج ہے۔ جس میں خلیفہ کی نسبت تمام سچے مسلمانوں کے فرائض بیان کئے گئے ہیں۔ جن میں نقصانات نقدی اور اخلاقی اور جسمانی شامل ہیں۔ چٹھی مذکور کے خاتمہ پر یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ اسلام کی قوت اتفاق اور یکجہتی پر منحصر ہے۔ یہ چٹھی خاص ایلچیوں کی معرفت ہندوستان اور مصر اور عرب کے شیوخ اور علماء کے پاس بھیجی جاوے گی"

اس ٹیلی گرام کا ترجمہ ہمارے پچھلے اخبار میں چھپ چکا ہے مگر اس وقت ہم اس ٹیلی گرام کے مضمون پر غور کرتے ہیں کہ وہ صحیح ہے یا اس میں کچھ غلطی ہے ہمارے نزدیک جہاں تک اس کا مضمون ہندوستان کے مسلمانوں سے متعلق ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہمارے نزدیک ممکن ہے کہ سلطان نے اسی مضمون کی کوئی چٹھی مصر اور عرب کے علماء اور شیوخ کے پاس بھیجی ہو۔ مگر ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس ایسی چٹھی کا بھیجنا ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور ظاہراً ٹیلی گرام کا یہ بیان کہ "سلطان نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مبارک بادی کے جواب میں یہ چٹھی لکھی ہے۔ اور یہ چٹھی خاص ایلچیوں کی معرفت ہندوستان کے علماء کے پاس بھیجی جاوے گی۔" صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ہماری دانست میں بموجب نیشنل لاء کے سلطان کو اس قسم کی پولیٹکل تحریر کرنے کا کسی دوسری سلطنت کی رعایا کو بلا توسط وہاں کی گورنمنٹ کے اختیار نہیں ہے اور ہم ہرگز خیال نہیں کرسکتے کہ سلطان ٹرکی کو یہ امر معلوم نہ ہو۔

مسلمانان بمبئی نے جو تار مبارکباد فتح کے بھیجے تھے اس کا جواب بھی سلطان نے براہ راست مسلمانان بمبئی کو نہیں بھیجا تھا بلکہ اپنے ایمبسڈر مقیم بمبئی کے پاس وہ جواب بھیجا تھا۔

ہم نے سنا ہے کہ مسلمانان شملہ نے بھی تار مبارک باد فتح کا سلطان کی خدمت میں بھیجا تھا۔ مگر چونکہ شملہ میں کوئی ایمبسڈر سلطان کی طرف سے نہیں ہے اس واسطے سلطان ۔ ۔

اس کا جواب اپنے ایمبسڈر مقیم لنڈن کے پاس بھیجا۔ اور لنڈن کے ایمبسڈر نے اس کا جواب مسلمانان شملہ کے پاس بھیجا۔ ہم کو ٹھیک معلوم نہیں ہے کہ یہ امر صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن قیاساً معلوم ہوتا ہے کہ صحیح ہوگا پس جبکہ سلطان نے ایسی احتیاط ہندوستان کے مسلمانوں کی مبارک باد کے جواب بھیجنے میں کی ہے تو ہم سمجھ نہیں سکتے کہ سلطان نے کوئی ایسی چٹھی براہ راست مسلمانان ہندوستان کے نام لکھی ہو۔ اور اپنے ایلچیوں کی معرفت براہ راست ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس بھیجیں۔ بالفرض اگر سلطان نے ایسا کیا ہو جو ہماری رائے میں ہرگز نہیں کیا ہوگا تو گورنمنٹ انڈیا کو از روئے نیشنل لاء کے اختیار کامل ہے کہ ایسے ایلچی کو ہندوستان میں نہ آنے دے اور جو چٹھی اس کے پاس ہو اسکو ضبط کرلے۔

مذکورہ بالا ٹیلی گرام میں لکھا ہے کہ اس چٹھی میں خلیفہ کی نسبت تمام سچے مسلمانوں کے فرائض بیان کئے گئے ہیں۔ جب کہ ہندوستان کے مسلمان سلطان ٹرکی کی رعایا نہیں ہیں تو ہندوستان کے مسلمانوں کو خلیفہ کی نسبت کیا فرائض بیان ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بجز اس کے کہ وہ جس سلطنت کی حکومت میں بطور رعایا کے رہتے ہیں اس کے خیر خواہ اور وفادار رہیں اور کچھ فرض نہیں ہے۔

ایک اور فقرہ اس ٹیلی گرام میں مندرج ہے کہ "جو فرائض مسلمانوں کے بیان کئے گئے ہیں ان میں نقصانات نقدی اور اخلاقی اور جسمانی بھی شامل ہیں" ہم تو اس فقرہ کا کچھ مطلب ہی نہیں سمجھ سکتے۔ اور اگر کچھ مطلب ہو تو وہ مصر اور عرب کے مسلمانوں سے متعلق ہوگا جو سلطان کی رعیت ہیں۔ مگر ہندوستان کے مسلمانوں سے نہ متعلق ہو سکتا ہے۔ اور نہ اس کے کچھ معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو تہنیت نامے مصر اور عرب سے اس فتح کی بابت سلطان کی خدمت میں آئے ہیں۔ شاید ان کے جواب میں کوئی چٹھی سلطان نے لکھی ہو۔ مگر ٹیلی گرام بھیجنے والے نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے جو مبارک بادی بھیجی ہے اس کے جواب میں وہ چٹھی ہے۔

سلطان نے جو یونانیوں پر فتح پائی۔ اس سے کوئی ایسا مسلمان نہ ہوگا۔ جس کا دل خوش نہ ہوا ہو۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ سلطان کی اس فتح سے ہمارا دل بھی نہایت خوش ہوا ہے۔ لیکن جو کچھ ہندوستان کے مسلمانوں نے کیا۔ بلا اجازت اور مرضی گورنمنٹ کے ہم اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔ گو گورنمنٹ نے اس [illegible] اعتنا نہیں کیا۔ مگر جن مسلمانوں کو ایسا کرنا تھا ہمارے

نزدیک ضروری تھا کہ اولاً گورنمنٹ سے اس کی اجازت حاصل کرتے اور اس کے بعد جو کچھ ان کو کرنا تھا کرتے۔ ہم ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ایسے پولیٹکل امور میں جو دوسری سلطنتوں سے متعلق ہیں بلا اجازت اور مرضی گورنمنٹ ہندوستان کے مسلمانان ہندوستان کوئی کاروائی کریں۔ کیونکہ ہمارا قانونی اور مذہبی فرض یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اپنی گورنمنٹ کے وفادار اور اس کی مرضی اور پالیسی کے تابع رہیں۔ اور یہ بات تو کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ دکن کے ہندوؤں نے کس خیال سے سلطان کو اس فتح کی بابت مبارک بادی بھیجی۔ کیا وہ بھی ان فرائض میں داخل ہونا چاہتے ہیں جو سلطان مسلمانوں کی نسبت قرار دے۔

آخر کو ہم پھر بیان کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا ٹیلی گرام یا تو غلط ہے یا اس میں مسلمانان ہندوستان کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

جب کہ ترکوں نے سیاسٹپول کی لڑائی میں روسیوں پر فتح پائی تھی اس وقت مسلمانان ہند نے کوئی علامت ایسی خوشی کی ظاہر نہیں کی تھی جیسے کہ یونانیوں پر فتح پانے پر ظاہر کی ہے۔

سیاسٹپول کی لڑائی میں خود انگریزی گورنمنٹ نے ترکوں کے لئے ہندوستان میں چندہ کرنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن اگر ہماری یاد میں کچھ غلطی نہ ہو تو اس وقت بھی ترکوں کے لئے کوئی معتد بہ چندہ ہندوستان میں نہیں ہوا تھا۔

پس یہ بات غور کرنے کی ہے کہ یونان پر فتح پانے میں ہندوستان کے مسلمانوں نے کیوں ایسی گرم جوشی ظاہر کی ہے۔

ہماری رائے میں اس کے دو سبب ہیں۔ اول یہ کہ یورپ کے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کوئی بہت بڑا تعلق سلطان ٹرکی سے نہیں ہے۔ پس مسلمانان ہندوستان نے عملی کاروائی سے ظاہر کیا کہ ان کو سلطان ٹرکی سے جو حرمین شریفین کا محافظ ہے خاص قسم کا تعلق ہے۔ قطع نظر اس سے کہ سلطان مذہبی خلیفہ ہے یا نہیں اور مسلمانوں کو اس کے احکام کا تسلیم کرنا لازم ہے یا نہیں۔

دوسرے یہ کہ مسٹر گلیڈسٹون اور دیگر ریڈیکل ممبران پارلیمنٹ نے نہایت سخت اور محض بیجا اور ناواجب زبان درازی سلطان ٹرکی اور ترکوں کی نسبت کی تھی۔ جس سے مسلمانان ہند کے دل نہایت رنجیدہ تھے۔ جبکہ ترکوں کو یونانیوں پر فتح ہوئی تو جس قدر اس زبان درازی سے مسلمانوں کو رنج ہوا تھا اسی قدر ان کو خوشی کرنے کا موقع ملا۔ مگر اس خوشی کو کسی پولیٹکل امور پر محمول کرنا ہماری رائے میں بیجا ہے۔ اور اس سے زیادہ اور کوئی امر ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔

ترکوں کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردی

اگر کوئی شخص ہمارے دوست کی جان بچائے یا مصیبت کے وقت اس کے ساتھ ہمدردی کرے تو ہم کو اس کا شکر کرنا لازم ہے یا نہیں؟

سب سے بڑا سخت وقت ترکوں پر وہ تھا جب کہ ۱۸۵۵ء میں روس نے ترکوں سے لڑائی شروع کی جو جنگ کریمیا کے نام سے مشہور ہے اس وقت سلطنتیں یعنی انگلستان اور فرانس نے ترکوں کے ساتھ ہمدردی کی۔ اور فوج سے روپیہ سے۔ ترکوں کی مدد کی۔ اور کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اگر انگلستان اور فرانس اس زمانہ میں ترکوں کی مدد نہ کرتے تو سلطنت ٹرکی کا یقینی خاتمہ ہو جاتا۔ پس اب سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں کے ساتھ ہمدردی ہے تو کریمیا جنگ کے فتح ہونے کے بعد کس وجہ سے مسلمانوں نے گورنمنٹ انگریزی اور گورنمنٹ فرانس کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اور ان کے لئے مساجد اور معابد میں کیوں نہیں دعا کی اور کیوں پیغام تربرقی شکریہ کے یا ایڈریس شکرگذاری کے انگلش اور فرنچ گورنمنٹ کے پاس نہیں بھیجے۔

ایک انگریز کا قول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بڑے احسان فراموش ہیں کہ جس زمانہ میں انگریزوں نے جان و مال سے ترکوں کی مدد کی تھی اسی کے قریب یعنی ۱۸۵۷ء میں انہوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے مقابلہ میں غدر کیا۔ اگر درحقیقت ان کو ترکوں کے ساتھ ہمدردی ہوتی۔ تو اس بہت بڑے احسان کو جو انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ کیا تھا ہرگز فراموش نہ کرتے اور انگریزوں اور انگریزوں کی حکومت کے مقابلہ میں بغاوت نہ کرتے۔

ہم تو اس قول کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے کہ ہمارے نزدیک ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ساتھ کسی کے دل میں بغاوت کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ بلکہ بقول ایک بڑے مورخ مسٹر" کے کہ وہ بغاوت نہیں تھی۔ صرف ایک سیپائی وار تھی۔ اور جو فسادات کہ اس زمانہ میں ہوئے وہ بدعملی ہو جانے کے سبب سے ہوئے۔ نہ اس وجہ سے کہ رعایا کو انگریزوں کے مقابل میں بغاوت کرنی مقصود تھی۔ مگر ہاں اس کا کچھ جواب نہیں ہے کہ اس وقت کیوں ہندوستان کے مسلمانوں نے گورنمٹ انگلستان اور گورنمنٹ فرانس کا شکریہ ادا نہیں کیا۔

پھر ۱۸۷۶ء میں دوبارہ ترکوں اور روسیوں کے درمیان لڑائی ہوئی جس میں عثمان پاشا غازی کی بہادری کے کارنامے ہندوستان کی ہر ایک گلی اور کوچے میں مشہور تھے۔ مگر بدبختی سے ترکوں کی شکست ہوئی۔

اور ۱۸۷۸ء میں روسی پلونا اور درہ شبکا کو فتح کرتے ہوئے قسطنطنیہ کی دیواروں تک جا پہنچے۔ اس وقت ترکوں کی سلطنت کے نیست و نابود ہو جانے میں کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ مگر گورنمنٹ انگریزی ان کی حمایت کو اٹھی اور اپنے جنگی جہاز قسطنطنیہ کے سمندر میں بھیج دئے اور روس سے کہا کہ بس آگے قدم نہ بڑھائیں اور صرف انگلستان کے بیچ میں پڑنے سے برلن کا عہدنامہ تحریر ہوا۔ اور سلطنت ترکی جیسے کہ اس زمانہ میں ہے باقی رہی۔ اگر انگلستان ترکوں کی مدد نہ کرتا تو ترکوں کی سلطنت کا باقی رہنا محال تھا۔

اوہم پاشا نے یونانیوں کی حال کی لڑائی میں اس سے زیادہ بہادری اور دلاوری نہیں دکھائی جس قدر کہ عثمان پاشا نے پلونا میں دکھائی تھی۔ پس کس وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں نے اوہم پاشا کا بہت شکر کیا۔ اور عثمان پاشا کی نسبت کچھ نہیں کیا۔ ہمارے پاس اس کا کچھ جواب نہیں ہے ہمارے نزدیک جو کچھ اس وقت مسلمانوں نے کیا وہ صرف ان کی ایک خفیف الحرکتی تھی اور ایک کے دیکھا دیکھی اوروں نے بھی وہی کیا جو انہوں نے کیا تھا۔

جو لوگ اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے جو یونان کی فتح پر اس قدر خوشی منائی۔ وہ کسی پولیٹیکل امر پر مبنی تھی۔ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے اور بجز خفیف الحرکتی کے اور کوئی امر نہیں ہے۔ سلطان کو خلیفہ ماننا اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے جس طرح کہ بنی امیہ اور بنی عباس کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو سلطان ترکی کے احکام کو مثل احکام پوپ کے واجب التعمیل سمجھتا ہو یا مثل احکام خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے جانتا ہو۔ پس کسی طرح پر خیال نہیں ہو سکتا۔ کہ ان کا خوشی منانا اور مبارک باد کے تار بھیجنا کسی پولیٹیکل امر پر مبنی ہو۔ گو کہ ہمارے نزدیک ان کا ایسا کرنا بھی بلا اجازت گورنمنٹ کے جس کے کہ وہ رعیت ہیں ہرگز مناسب نہیں تھا۔

اس وقت سلطان نے تھسلی کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے معاملہ میں تمام یورپ کی سلطنتوں کی رائے کو نہیں مانا۔ ہم بھی نہیں چاہتے کہ سلطان تھسلی سے اپنا قبضہ اٹھالے۔ مگر معلوم نہیں کہ اس انکار کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور کون سلطنتیں سلطان کی دوست اور کون

سلطنتیں اس کی مخالف ہو جائیں گی- یا کوئی متوسط امر سب سلطنتوں کی صلاح سے قرار پائے گا لیکن یہ باتیں پولٹیکل معاملات سے علاقہ رکھتی ہیں ان کو مذہبی لباس پہنانا ہمارے نزدیک بالکل ناواجب ہے کیونکہ ہر ایک سلطنت اپنی پولٹیکل مصلحت کو قائم رکھنا چاہتی ہے- خواہ وہ مصلحت ترکوں کے مقابلہ میں ہو- خواہ روس جرمنی اور اٹلی کے مقابلہ میں- اور کبھی کوئی سلطنت اپنی پولٹیکل مصلحت کو فروگذاشت نہیں کرتی- ہاں جو سلطنتیں کہ ضعیف ہیں ان کی پولٹیکل مصلحت یہی ہوتی ہے کہ جو سلطنت قوی ہے اس کی رائے کو تسلیم کریں- کیونکہ اس میں وہ اپنی بھلائی تصور کرتی ہیں- اور قوی سلطنت سے مقابلہ کرنا نہیں چاہتی اس زمانہ میں تمام معرکہ آرائیاں اسی بنا پر ہوتی ہیں نہ کسی مذہبی بنا پر-

تعلیم

تعلیم سے ہماری مراد موافق عرف عام کے لکھنا پڑھنا سیکھنے سے ہے ہر زمانہ میں لاکھوں کروڑوں آدمی مختلف مقاصد سے لکھنا پڑھنا سیکھتے رہے ہیں۔

عام مقصد جس کے سبب سے تعلیم پر توجہ ہوتی ہے خواہ تعلیم پانے والے خود اس پر متوجہ ہوں یا اطفال کے مربیوں نے اطفال کی تعلیم پر توجہ کی ہو یہ ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہوتی ہے کہ ایک جاہل کندہ ناتراش سے لکھا پڑھا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوئی ہو زندگی کے کاروبار میں اس کے لئے نہایت مفید اور کار آمد ہوتی ہے۔

ان تعلیم پانے والوں میں لاکھوں آدمی تو ایسے ہوتے ہیں کہ ادنے درجہ تعلیم تک پہنچ کر اور کچھ متوسط درجہ کی تعلیم تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں اور چند ایسے ہوتے ہی کہ متوسط درجہ کی تعلیم سے آگے بڑھتے ہیں اور اپنے مذاق کے موافق علم کی شاخوں میں سے کسی شاخ کی تکمیل پر مائل ہوتے ہیں۔ کوئی شاعر بننا چاہتا ہے کوئی ادیب۔ کوئی فلسفہ میں ترقی کرتا ہے اور کوئی ریاضیات میں اور کوئی دینیات میں۔ وعلے ہذا القیاس۔ مگر ہر ایک کے ساتھ حصول معاش کا خیال لگا رہتا ہے اور جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے اس کو ذریعہ حصول معاش ضروری سمجھتا ہے۔

تعلیم بغیر اس کے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی زبان اختیار کی جاوے غیر ممکن ہے جس زمانہ میں جس زبان کا عروج ہوتا ہے وہی زبان اس کے لئے اختیار کی جاتی ہے یہ ایک کلیہ قاعدہ ہے کہ جس ملک میں جو زبان حکومت کرتی ہے اسی زبان کا عروج ہوتا ہے۔ خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ میں عربی زبان کا عروج تھا۔ ہر شخص اسی زبان میں علوم کو سیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانہ میں ہندوستان میں سنسکرت زبان کا عروج تھا۔ اسی کو لوگ اختیار کرتے تھے۔ جب مسلمانوں کی عملداری ہندوستان میں ہوئی تو فارسی زبان کا عروج ہوا اور سب نے فارسی زبان میں تعلیم پانا اختیار کیا۔ اب ہندوستان میں انگریزی حکومت ہے۔ جس کی زبان انگریزی ہے اور اسی زبان کو عروج ہے اس لئے ہر شخص اسی زبان کے اختیار کرنے پر مائل ہے۔ ہاں مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں بہت کچھ کوتاہی کی۔ اس کے کچھ ہی سبب ہوں مگر اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی غلطی

سے انگریزی زبان پڑھنے کو مخالف مذہب اسلام سمجھتے تھے۔ مگر جب سے یہ خیال کم ہو گیا یا دنیوی ضرورت نے انہیں مجبور کیا اس وقت سے مسلمانوں نے بھی انگریزی زبان میں تعلیم اختیار کرنی شروع کر دی ہے مگر بہت سے مسلمان مذہب کو دنیوی ضرورت سے مقدم سمجھتے ہیں اور اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان میں یہ خیال کہ انگریزی پڑھنی مذہب اسلام کے برخلاف ہے کم ہو گیا ہے۔

اکثر حکام کا اور نیز بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ لوگ صرف سرکاری نوکری حاصل کرنے کو انگریزی پڑھتے ہیں۔ مگر غور کرنے کی بات ہے کہ ہر سال ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے سینکڑوں بی۔ اے اور ایم۔ اے ڈگری پاتے ہیں اور ان کو یقین کامل ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کے پاس اس قدر نوکریاں نہیں ہیں کہ وہ اس جم غفیر بی۔ اے اور ایم۔ اے ڈگری یافتوں کو دے سکے۔ پس یقینی ڈگری یافتہ طالب علموں کو اس کا یقین ہے کہ سب کو سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ باوصف اس یقین کے جو وہ انگریزی پڑھنے پر مشغول ہیں تو ضروری ہے کہ سوائے ملازمت سرکاری کے اور کسی ذریعہ سے بھی ان کو معاش حاصل کرنے کا خیال ہے۔ یا اس بات کا یقین ہے کہ انگریزی پڑھا ہوا بن انگریزی پڑھے ہوئے سے دنیوی کاروبار کے لئے زیادہ مفید اور کار آمد ہے۔ بہرحال یہ بات غلط ہے کہ ہر ایک بی۔ اے اور ایم۔ اے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے پڑھتا ہے اور نہ ملنے کے سبب سرکار سے ناراض ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کو پہلے سے یقین ہے کہ سرکار سب کو نوکری نہیں دے سکتی۔ ہاں جب موقع ہوتا ہے تو ہر ایک سرکاری ملازمت ملنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کو ضرور کرنی چاہئے۔

اس زمانہ کی تعلیم جو بذریعہ انگریزی زبان کے ہوتی ہے اور اگلے زمانہ کی تعلیم میں جو بذریعہ عربی زبان کے ہوتی تھی یہ فرق ہے کہ اگلے زمانہ میں تعلیم کا سامان ایسا موجود اور مہیا تھا کہ ہر شخص جو علم کی کسی شاخ میں یا شاخوں میں اس زمانہ کے موافق اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا اور اس فن کا ماسٹر ہونا چاہے تو ہو سکتا تھا۔ اور سوسائٹی جو اس زمانہ میں موجود تھی اس تعلیم کی مدد کرتی تھی۔ اور اس پر عمدہ اخلاقی اثر ڈال کر اس کو اس سوسائٹی کے لائق کر لیتی تھی۔ اگلے زمانہ کی سوسائٹی بلحاظ اخلاق اور حسن معاشرت کے ایسی عمدہ تھی کہ اس میں کوئی نقص اس زمانہ میں بھی نہیں نکالا جا سکتا مگر افسوس ہے کہ زمانہ کے انقلاب کے ساتھ وہ قائم نہ رہی۔

اس زمانہ کی تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص کسی علم کی کسی شاخ میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہے تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاکر اس فن کا ماسٹر ہو سکے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم دینے والی وہ یونیورسٹیاں ہیں جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ وہ بلاشبہ بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ مگر اس تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کہنا ہمارے نزدیک محض ناواجب ہے۔ بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجہ کی تعلیم ہے اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے۔

بالفعل جو باتباع احکام یونیورسٹیوں کے اس کے ماتحت کالجوں میں تعلیم دی جاتی ہے وہ زیادہ تر کتابی اور دماغی تعلیم سے متعلق ہے۔ اس قسم کی تعلیم کا نتیجہ ضرور وہی ہونا چاہئے۔ جو مسٹر کرول نے اپنے لکچر میں بیان کیا ہے اور جس کو اودھ اخبار نے اردو زبان میں لکھا ہے انہوں نے فرمایا کہ "تعلیم کا منشا یہ نہیں ہے کہ چند آدمیوں کی دولت بڑھ جائے یا آنکہ غربا کے بمقابلہ باقی ماندہ اشخاص کی زیادہ رعایت کی جائے اور نہ تعلیم کا منشا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگ صرف اپنی باہمی محافظت کریں یا سوداگری اور تجارت ہی کو ترقی دیں۔ بلکہ تعلیم کی خاص رعایت اور اصل منشاء یہ ہے کہ لوگ نیک محضر اور عمدہ قسم کے باشندے ہو جاویں۔ اور وہ خاموشی حاصل کریں جو زندگی کے بے داغ رہنے سے حاصل ہو سکتی ہے اور لوگوں کے سوشیل اور اخلاقی خصائل کی تکمیل کریں۔ اور ان بھاری اور عمدہ کاموں کا حوصلہ دلائیں جن سے ملک کی عزت اور زینت ہوتی ہے۔

سر ولیم میسکورتھ ینگ نے جو ڈگری یافتہ طالب علموں کو مخاطب کر کے فرمایا اس کا حاصل بھی وہی ہے جو مسٹر کرول نے اپنے لکچر میں کہا تھا۔ سر ولیم میسکورتھ ینگ نے ڈگری یافتہ طالب علموں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "ان کی ڈگریاں اس بات کے لئے ہیں کہ وہ اپنے یومیہ معاملات اور گفتگو میں معزز برتاؤ اختیار کریں۔ اخلاق اور عمدہ تعلیم کی ترقی میں مدد دیں۔ سوشیل انتظام اور اپنے ہم محسنوں کی بہبودی کے قائم رکھنے میں کوشاں رہیں۔ المختصر ایک بھاری سلطنت کے سربر آوردہ شہریوں کے فرائض ادا کرتے رہیں"۔

مگر ہماری رائے میں اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے۔ ہندوستان میں جو قدیم سوسائٹی علماء اور نیک خداپرست رحم دل نیک خصلت لوگوں سے مرکب تھی وہ مدت ہوگئی کہ مردہ ہوگئی ہے۔ اور نئی سوسائٹی

جو زمانہ حال کے موافق ہو اب تک قائم نہیں ہوئی یا مکمل نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ نتائج جس کا ذکر مسٹر کرول نے اپنے لکچر میں کیا یا سر ولیم میسکورتھ ینگ نے ڈگری یافتہ طالب علموں سے خواہش کی حاصل نہیں ہوتی۔

ہم اس بات کو جیسا کہ اودھ اخبار نے لکھا ہے نہایت مفید اور ضروری سمجھتے ہیں کہ "سکول ماسٹروں کو چاہئے کہ اپنے شاگردوں کے نقش ذہن کرتے رہیں۔ کہ وہ اعلیٰ درجہ کا چلن اور شریفانہ الوالعزمیاں اختیار کریں۔ اور اسی طرح ہمارے کالجوں کے پروفیسروں کو بھی منجملہ ایسے لوگوں کے ہونا چاہئے جن میں خیالات عالیہ پائے جاتے ہوں"۔ مگر ہماری رائے میں جب تک خود اسی قوم کے چند لوگ اس قوم کی سوسائٹی کے مہذب کرنے پر آمادہ نہیں اور دلی سعی و کوشش نہ کریں۔ سوسائٹی کی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ اور یہی سبب ہے کہ باوجودیکہ کئی قرن گورنمنٹ کو ہندوستانیوں کو تعلیم دیتے ہوئے گذرے مگر ان کی سوسائٹی کی حالت اب تک درست نہیں ہوئی۔

نہایت مشکل یہ ہے کہ دنیا میں کسی قوم کی سوسائٹی اور سوشیل حالت ایسی نہیں ہے کہ جس میں ایسے امور بھی شامل نہ ہوں جن کی بناء غلط یا صحیح طور پر مذہبی امور پر مبنی ہوئی نہ کہی جاتی ہو۔ پس اگر وہ امور ترقی سوسائٹی کے مانع ہیں اور غلطی سے ان کی بنا مذہبی امور پر کہی جاتی ہے تو جب تک اسی قوم کا کوئی شخص اس غلطی کو ظاہر نہ کرے اور اس مانع کے رفع کرنے میں کوشش نہ کرے تو وہ رفع نہیں ہو سکتی۔ غیر قوم کے شخص کا اس امر مانع پر متنبہ کرنا گو وہ کیسا ہی سچ کہتا ہو مخالف اثر پیدا کرتا ہے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ وہ شخص بہ سبب اختلاف قومی یا مخالف مذہب کے ایسا کہتا ہے اگرچہ ہم قوم اور ہم مذہب والے پر بھی ہزاروں شخص طرح طرح کے اتہام لگاتے ہیں اور اس کی بات کی سماعت نہ ہونے پر کوشش کرتے ہیں اور گورنمنٹ تو ایسی کوئی بات جس سے مذہب میں مداخلت کرنے کا شبہ بھی ہو اختیار نہیں کر سکتی۔ غرضیکہ اخلاقی اور شریف النفسی کی تعلیم عمدہ سوسائٹی پر منحصر ہے۔ اور انگریزی گورنمنٹ سوائے تعلیم دینے کے اور کوئی طریقہ اختیار نہیں کر سکتی جس سے ہندوستانیوں میں سوسائٹی کی حالت اچھی ہو اور عمدہ سوسائٹی ان کی بن جاوے۔

دماغی تعلیم جس کا ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا کچھ شبہ نہیں ہے کہ انسان کو انسان اور اس کی عقلی اور دماغی قوتوں کے کامل اور اس کے اخلاق کو عمدہ بنانے میں بہت کچھ مدد کرتی ہے۔

مگر جب مسئلہ حصول معاش پر نظر کی جاتی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ یقینی امر ہے کہ محض علمی پیشوں میں حصول معاش کی ذرا بھی گنجائس باقی نہیں ہے اور اس لئے ان کا اور نیز ہمارے احکام کا اس طرف خیال جاتا ہے کہ حرفت اور فن کی تعلیم کو جسے سینز اور ٹیکنیکل ایجوکیشن سے تعبیر کیا جاتا ہے یا وہ وسعت دی جاوے۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن کے معنی تو ہم آج تک نہیں سمجھے کہ اس سے کیا مراد ہے اگر اس کی مراد حرفوں کی تعلیم سے ہے جیسے لوہاری۔ بخاری۔ نوربافی وغیرہ وغیرہ تو اس کی ضرورت تو ہم ہندوستان میں بہت کم پاتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہندوستان میں نہیں ہے۔ اگر یورپ کو یا اور کسی ملک کو اس باب میں کچھ تفوق ہے تو وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ جو کام ہندوستان میں ہاتھوں سے ہوتا ہے وہ ان ملکوں میں کلوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ مگر کلیں قائم کرنے والے وہ لوگ نہیں ہیں جو ان میں کام کرتے ہیں۔ بلکہ کلوں کے قائم کرنے والی ایک جدا جماعت ہے۔ ہندوستان میں اگرچہ کہیں کہیں ایسی جماعتیں قائم ہوئی ہیں مگر ہندوستان میں عام طور پر ایسی جماعتوں کا قائم ہونا ظاہراً بہت دور اور بعض وجوہ سے اگر ناممکن نہیں تو مشکل تو ضرور معلوم ہوتا ہے۔

سینز بلاشبہ نہایت عمدہ چیز ہے اور سینز کا جاننے والا آج کل کے زمانہ میں قریب قریب ہر حرفت پر پورا پورا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور معاش حاصل کرنے کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ اس کے پاس ہوتا ہے جیسا کہ یورپ کے ملکوں میں دیکھا جاتا ہے مگر یورپ کے ملکوں کا قیاس ہندوستان پر نہیں ہو سکتا۔ یورپ میں ہر قسم کے متعدد کارخانے موجود ہیں اور اس لئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں سینز کی تعلیم دینا فائدہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ ہر قسم کے سینز جاننے والے کے لئے ہر قسم کے کارخانے موجود ہیں جن میں وہ جا سکتا ہے اور اپنی معاش پیدا کر سکتا ہے۔ مگر ہندوستان میں اس قسم کے کارخانے نہیں ہیں اور نہ ابھی ان کے ہونے کی توقع ہے۔ پس سینز جاننے والا بجز اس کے کہ سینز کا عالم ہو کر اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور کوئی ذریعہ معاش کا حاصل نہیں کر سکتا۔ گورنمنٹ ڈاکٹری۔ انجینئری، نقشہ نویسی وغیرہ کی جو ٹیکنیکل ایجوکیشن یا سینز میں داخل ہیں بقدر ضرورت اس ملک کی تعلیم دیتی ہے اور اس ذریعہ سے وہ لوگ معاش بھی پیدا کرتے ہیں مگر اس سے زیادہ تعلیم کی نہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں گنجائش ہے اور نہ وہ اس تعلیم سے کچھ معاش پیدا کر سکتے ہیں۔

بڑی ضرورت ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی اور اخلاقی اور سوشیل حالت کی درستی کی ہے جو ابھی تک نہیں ہوئی یا پورے طور پر نہیں ہوئی اس کے بعد باقی امور لحاظ کے قابل ہیں۔ پس ہم کو مناسب نہیں ہے کہ ہم دفعتہً سب امور کا ہوا چاہیں بلکہ جو کام ہم کو پہلے کرنا ہے اس کو مقدم سمجھیں اور اس کے بعد جو کام کرنے ہیں وہ کریں۔

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم اور گورنمنٹ

ایک زمانہ ہندوستان پر ایسا گذرا ہے کہ بڑے بڑے پولیٹشنوں کی یہ رائے تھی کہ ہندوستانیوں کو علوم جدیدہ اور زبان انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دینا نہیں چاہیے بلکہ ان کو ایشیائی علوم میں جو محض بے سود ہیں غلطاں اور پیچاں رہنے دینا مناسب ہے۔ تاکہ ہندوستان کو زیر رکھنے اور ہندوستان کو وحشیوں کی حالت سے آگے نہ بڑھنے اور ان کی آنکھ کے نہ کھلنے دینے کو اس سے بہتر کوئی پالیسی نہیں ہے۔

ان کے برخلاف چند نیک دل پالیٹشن ایسے تھے۔ جن کی یہ رائے تھی کہ نہیں ہندوستانیوں کو اعلیٰ تعلیم دینا چاہئے اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو اپنا فرض ان لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے ہم کو حکومت دی ہے ادا نہیں کریں گے۔

چند سال تک پہلوں کی رائے غالب رہی اور ایشیائی علوم اور ایشیائی زبانوں کی تعلیم پر بڑی سرگرمی رہی۔ آخر کار پچھلوں کی رائے غالب آئی۔ جس کا نتیجہ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کا قائم ہونا ہے۔ مگر یہ مت سمجھو کہ پہلی رائے معدوم ہو گئی ہے۔ بلکہ اب تک موجود ہے اور اس کے پھر زندہ ہونے کے آثار معلوم ہوتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ وہ پھر زندہ ہو جاوے یا زندہ ہو گئی ہو۔

ہندوستان کی یونیورسٹیاں مثل انگلستان کی یونیورسٹیوں کے اعلی تعلیم کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ مگر اس کو اعلیٰ تعلیم کہنا نہایت شرم کی بات ہے۔ اعلیٰ تعلیم صرف چند کتابوں کے پڑھ لینے اور طوطے کی طرح یاد کر لینے اور امتحان دے دینے اور انگریزی میں (آئی ٹلی ٹیل) بول لینے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے سب سے بڑی تعلیم دینے والی عمدہ سوسائٹی ہے۔ جس کا وجود ہندوستان میں نہیں ہے اور شاید صدیوں تک ابھی نہیں ہونے کا۔ ایک دانشمند کا قول ہے کہ انگلستان میں بچوں اور طالب علموں کو کتاب پڑھنے سے اس قدر تعلیم نہیں ہوتی جس قدر کہ کان اور آنکھ سے ہوتی ہے۔

تربیت تعلیم کا بہت بڑا رکن ہے۔ مدرستہ العلوم میں ہم نے طالب علموں کی تربیت پر حتے المقدور کوشش کی ہے مگر انگلستان کے کالجوں اور سکولوں کی سی تربیت تو محال ہے البتہ اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مدرستہ العلوم میں تعلیم کے ساتھ

عمدہ تربیت بھی ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے انگلستان کے کالجوں میں ان طالب علموں کے لئے جو اعلیٰ درجہ کی ڈگری پاتے ہیں۔ ان علوم میں ترقی کرنے کو جن کا ان کو مذاق ہے ہزاروں روپیہ سال کی فلوشپ دی جاتی ہے۔ جس سے وہ فارغ البال ہو کر اس علم میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کرتے ہیں اور نئی نئی ایجادوں اور عمدہ عمدہ تصانیف سے ملک کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور علم کو قوم میں شائع کرتے ہیں۔

ہندوستان کے کسی کالج میں اس کا وجود بھی نہیں ہے۔ اور ہندوستان کے طالب علم جو کچا پکا علم کالجوں سے حاصل کرتے ہیں اس کی ترقی کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور اس لئے جو کچھ انہوں نے سیکھا ہے۔ اس میں بھی روز بروز تنزل ہو جاتا ہے۔ ہم نے چاہا تھا کہ مدرستہ العلوم میں فلوشپ مقرر کرنے کا دستور جاری کریں۔ مگر اس کے لئے سرمایہ بہم نہیں پہنچ سکتا اس سبب سے مجبور ہیں۔

اس بیان سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم کہلائی جاتی ہے۔ وہ درحقیقت اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک ادنےٰ درجہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ مگر جہاں کسی نے کوئی ڈگری یونیورسٹی سے پائی اس نے سمجھ لیا کہ اب میں بہت بڑا عالم ہو گیا۔ اور کوس لمن الملک الیوم بجانا شروع کر دیا۔ مگر وہ آواز طبل سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ناواجب آزادی کو وہ اپنا ایمان بناتا ہے اور یہ سمجھتا بھی نہیں کہ آزادی کیا چیز ہے حب الوطنی کا بہت جوش اس کے دل میں اٹھتا ہے۔ مگر وہ نہیں سمجھتا کہ حب الوطنی کیا چیز ہے۔ اور کیونکر ہوتی ہے۔ پالیٹکس میں جو ایک بہت بڑا اور عمیق فن ہے اس میں تو اپنے تئیں وہ لاثانی سمجھتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نتیجہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور تربیت نہ ہونے کا ہے۔ یہ تمام باتیں صرف انہیں لوگوں میں نہیں ہوتیں جنہوں نے یونیورسٹی کی کوئی ڈگری پائی ہے۔ بلکہ ان طالب علموں میں بھی جنہوں نے اے۔ بی۔ سی۔ ڈی شروع کی ہے۔ یہ سب باتیں دیکھا دیکھی ان میں بھی ویسی ہی ہوتی ہیں۔ شور و شغب کرنا اور گورنمنٹ کی ہر ایک بات میں مخالفت کرنا اور ملک میں غل مچاتے پھرنا۔ ان کا شیوہ ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ اس زمانہ میں کانگریس والوں کا شیوہ ہے۔ اگر یہی نتیجہ انگریزی تعلیم کا ہے۔ تو ہم کو خوف ہے کہ ان پرانے پالیٹشنوں کی رائے پھر زندہ ہو جاوے گی اور اس رائے کا زندہ کرنا گورنمنٹ کا

فرض ہو جاوے گا۔ اور زیدہ تر مسلمان طالب علموں کا نقصان ہو گا۔ جنھوں نے ابھی چند روز سے انگریزی تعلیم پر کسی قدر توجہ کی ہے۔

بنگالیوں میں۔ دکن کے برہمنوں میں۔ پارسیوں میں بہت کثرت سے ایسے لوگ ہو گئے ہیں جو اپنی قوم کے برے بھلے لوگوں کو سنبھال سکیں گے۔ لیکن مسلمانوں کی ایسی حالت نہیں ہے۔ اگر مسلمان طالب علموں نے بھی ویسا ہی طریقہ اختیار کیا جیسا کہ ان قوموں کے طالب علموں نے اختیار کیا ہے تو ان کا دین اور دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں رہنے کا۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ پنجاب میں جو حضور ملکہ معظمہ قیصر انڈیا اسٹیچو کا قائم کرنے کی تجویز پیش ہوئی تھی اس میں کیا امر تھا جو اس قدر شور و غوغا کیا گیا اور ایسا طریقہ برتا گیا جو تہذیب کے بالکل برخلاف تھا۔

چند لوگوں نے یہ تجویز قرار دی تھی کہ ملکہ معظمہ قیصر انڈیا کا اسٹیچو لاہور میں قائم کیا جائے۔ جو لوگ اس کے بانی تھے۔ انہوں نے اس تجویز کو قطعی قرار دے دیا تھا۔ اور عام مجمع میں اس تجویز کو اس لئے پیش کیا تھا۔ کہ جو لوگ اس کو پسند کرتے ہوں اس میں شریک ہوں۔ اور جو لوگ اپنا روپیہ اس سے بہتر اور مفید کام میں لگانا چاہتے ہوں۔ ان کو اختیار کلی تھا کہ وہ اس میں شریک نہ ہوں اور چندہ نہ دیں۔ پس کوئی وجہ شور و شغب کرنے اور بے تہذیبی برتنے کی نہ تھی سیدھی بات تھی کہ جن لوگوں کا خیال کسی دوسرے مفید کام کی طرف تھا اس کے چندہ میں شریک نہ ہوتے۔ ہمارے نزدیک اگر سچی اور حقیقی اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے لوگ اس مجمع میں ہوتے تو نہایت خاموشی سے ان لوگوں کی تقریر سنتے اور پھر ان کو اختیار تھا کہ اس میں شریک ہوتے یا نہ ہوتے۔ مگر جو کچھ اس مجمع میں ہوا۔ اس کے ہونے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ہم تو اپنے کالج کے مسلمان طالب علموں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ کسی پولیٹکل مباحثہ میں کبھی نہ پڑیں۔ پولیٹکل امور میں کسی کالج کے طالب علموں کا کام نہیں ہے۔ بلکہ ان کو اپنے تحصیل علوم میں مشغول رہنا چاہئے۔ پولیٹکل امور ایسے نازک اور باریک ہیں کہ بڑی معلومات اور وسیع علم اور بہت سے تجربوں کے بعد اس میں رائے لگانے کا موقع ملتا ہے۔ جن کی معلومات نہایت محدود ہیں۔ جن کا علم ابھی کچا ہے وہ کیا رائے اس کی نسبت لگا سکتے ہیں۔

بہت لوگوں کا خیال ہے کہ جب مسلمان بھی اس قدر تعلیم یافتہ ہو جاویں گے جس قدر

کہ بنگالی ہیں تو وہ بھی ان کے ساتھ ہو جاویں گے اور تعلیم کو ایسا ہی بدنام کریں گے۔ جیسا کہ انہوں نے کیا ہے۔ اگرچہ ہم مسلمانوں کی تعلیم کے دل سے خواہاں ہیں۔ لیکن اگر اس تعلیم کا وہی نتیجہ ہو جو اور قوموں میں ہوا ہے تو خود ہم کو مسلمانوں کی تعلیم پر کوشش کرنے کا افسوس ہو گا اور ہم کو کہنا پڑے گا کہ ؎

بیشک ایں فتنہ است خوابش بردہ بہ

مگر ہم کو اپنے کالج کے مسلمان طالب علموں سے ایسی توقع نہیں ہے ان کو تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ہوتی ہے۔ وہ ہرگز گورنمنٹ کی مخالفت پر کمر نہیں باندھیں گے۔ اور گورنمنٹ کی پالیسی کو سمجھیں گے اور جانیں گے کہ گورنمنٹ کو کیا کیا مشکلیں پیش آتی ہیں اور کس خوبی اور عمدگی سے وہ ان کو حل کرتی ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہے رعایا کی آسودگی اور بہبودی اور خوشحالی میں کوشش کرتی ہے اور اگر ہم زیادہ تر لائق۔ زیادہ تر وفادار۔ زیادہ تر قابل اطمینان گورنمنٹ کے ہونگے۔ تو زیادہ آسائش سے زندگی بسر کریں گے۔ پس یہی طریقہ ہمارے مسلمان طالب علموں کو اختیار کرنا چاہئے۔

استجابت دعا کی نسبت مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف اشارہ

(مرزا غلام احمد صاحب قادیانی۔ اور وہ فرقہ جس کو وہ نیچری کہتے ہیں)

مرزا صاحب نے جو اشتہار ۲۵ جون ۱۸۹۷ کو جاری کیا ہے اس میں لکھا ہے "کہ ایک فرقہ نیچریہ مسلمانوں کی گردش ایام سے پیدا ہو گیا ہے یہ لوگ قبولیت دعا سے منکر ہیں"۔

ہم جناب مرزا صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ یہ خیال آپ کا صحیح نہیں ہے جس کو آپ نیچریہ فرقہ بتاتے ہیں وہ تو ہر ایک شخص کی دعا کے قبول ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے اور وہ یقین کرتا ہے کہ خدا مستجاب الدعوات ہے۔ اور وہ ہر ایک بندے کی دعا کو قبول کرتا ہے مگر دعا کے قبول ہونے کا مطلب وہ یہ بتاتے ہیں کہ اگر مسول عنہ مقدر میں ہے تو ہو جاتا ہے اور اگر اس کا ہونا مقدر میں نہیں ہے تو خدا دعا قبول کر کے دعا مانگنے والے کو ثواب آخرت دیتا ہے مگر کسی کی دعا کو وہ رد نہیں کرتا۔ پس ان کے عقیدہ کے موافق ہر شخص کی دعا قبول ہوتی ہے کسی کی دعا رد نہیں ہوتی۔ آپ کا یہ لکھنا کہ یہ لوگ قبولیت دعا کے منکر ہیں اس لائق ہے کہ اس پر کسی وقت خاص میں آپ دوبارہ غور فرمادینگے۔

غیر مذہب کے پیشواؤں کا ہم کو ادب کرنا چاہئے

ہم کو نہایت افسوس ہے۔ کہ جب ہم مذہبی مباحثوں کی کوئی کتاب دیکھتے ہیں۔ تو اس میں ایک مذہب والا دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا بری طرح سے ذکر کرتا ہے۔ یہ امر مذہب اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ جس مذہب کے جو پیشوا ہیں۔ جب ہم اپنے مذہبی مباحثوں میں ان کا ذکر کریں۔ تو ہم کو لازم ہے کہ ان کو برا نہ کہیں۔ بلکہ ادب و تعظیم سے ان کا ذکر کریں۔ خواہ وہ لوگ ہندو ہوں۔ یا پارسی۔ عیسائی ہوں یا یہودی یا خود مختلف عقائد کے مسلمان ہی ہوں۔ اگر ہم ان کے بزرگوں و پیشواؤں کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں گے۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ اسی طرح ہمارے بزرگوں اور پیشواؤں کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی سے پیش نہ آئیں۔ اس لئے خدا تعالی نے ہم کو حکم دیا ہے۔ کہ لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبو اللہ عدوا بغیر علم (سورہ انعام آیت ۱۰۸)

یعنی مت برا کہو ان کو جو خدا کے سوا اور کسی کی عبادت کرتے ہیں۔ پھر وہ بڑھ کر نادانستگی سے خدا کو برا کہیں گے۔ پس حقیقت میں غیر مذہب والوں کے پیشواؤں کو برا کہنا خود اپنے مذہب کے پیشواؤں کو ان سے کہلوانا ہے۔ جس کا گناہ انہیں پر ہوتا ہے جنہوں نے غیر مذہب کے پیشواؤں کو برا کہا ہے۔ علاوہ اس کے اخلاق اور متانت سے نہایت بعید ہے کہ ہم کسی مذہب کے پیشوا کا بے ادبی سے ذکر کریں۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

ہمارے بعد ہمارا نام رہیگا

یہ ایک نہایت لغو اور بے ہودہ خیال ہے جس کا کچھ نتیجہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بہت لوگ اس لغو خیال میں مبتلا ہیں۔ کوئی اولاد چاہتا ہے کہ اس کے بعد اس کا نام چلے۔ کوئی محل بناتا ہے۔ کہ اس کے بعد اس کا نام قائم رہے مگر ہم پوچھتے ہیں کہ اس سے فائدہ کیا ہے اگر اس کے بعد لوگوں نے کہا کہ یہ قلعہ اکبر کا بنایا ہوا ہے اور وہ قلعہ شاہجہان کا تو اس سے مرنے والے کو کیا فائدہ۔ مرنے والا تو مر گیا۔ "اپنی کرنی اپنی بھرنی" اپنے ساتھ لے گیا۔ اب لوگ کچھ ہی کہا کریں جو ہونی بات تھی وہ ہو گئی۔ سعدی فرماتے ہیں کہ ۔

زندست نام فرخ نوشیروان بعدل
گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند

اس شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ نوشیرواں کے بعد لوگ کہا کرتے تھے کہ نوشیرواں بہت عادل تھا۔ مگر یہ نہ کھلا کہ اس سے نوشیرواں کو کیا فائدہ ہوا۔ پس لوگوں کو جو یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمارے بعد ہمارا نام قائم رہے یہ کیوں ہوتی ہے اور اس سے ان کو کیا فائدہ ہوتا ہے ہمارے نزدیک تو یہ محض خیال خام ہے اور انسان کے دل کے بودے پن کی دلیل ہے انسان کو ہمیشہ یہ خیال رہنا چاہئے کہ میں کوئی ایسا کام کر جاؤں جس سے انسانوں کو قوم کو فائدہ پہنچتا رہے۔ مثلاً کسی علم کا ایجاد کرنا۔ کسی ہنر کا پیدا کرنا۔ یا کوئی ایسی بات ایجاد کرنا جو لوگوں کو فائدہ مند ہو یہ خیال بہت صحیح ہے کیونکہ اپنی ذات کے واسطے نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ ذات بھی فنا ہو جائے بلکہ زندہ لوگوں کے لئے ہے اور ایسوں کے لئے ہے۔ جن کا سلسلہ برابر قیامت تک جاری رہے گا۔ پس ہمارے خیال میں اس سے زیادہ انسان کے لئے کوئی بے وقوفی نہیں ہے۔ جو یہ خیال کرے کہ میں ایسا کام کر جاؤں۔ جس سے میرے بعد میرا نام جاری رہے۔

گذشتم از سرے مطلب تمام شد مطلب
حجاب چہرہ مقصود بود مطلبہا

ہندوستان اور انگلش گورنمنٹ

اور آخر کار جو ہونا تھا وہ ہوا۔ اور جو ہونا ہے وہ ہو گا۔ ایک عظیم مصیبت ہندوستان پر غدر ۱۸۵۷ء کی گذر چکی تھی۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں تعلیم کی کمی تھی اور ہندوستانی نہیں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ جس کی ہم رعیت ہیں ہم پر اس کا کیا حق ہے اور ہمارا اس کے ساتھ کیا فرض ہے اور تعلیم کی کمی سے آپس میں حاکم و محکوم میں ارتباط بھی کم تھا۔

اسی زمانہ کے قریب ہندوستان میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں جن کا مقصود ہندوستانیوں کو انگلش ایجوکیشن میں اعلیٰ درجہ تک تعلیم دینا تھا۔ بہت سے مدبران ملک ہندوستانیوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینی پسند کرتے تھے اور کچھ ناپسند کرتے تھے۔ اور گورنمنٹ کا فرض قرار دیتے تھے مگر اس بات پر کسی کا خیال نہ تھا کہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا ہونا بھی لازم ہے کیونکہ صرف تعلیم سے آدمی آدمی نہیں بنتا۔ اور اس کے اخلاق درست نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک منہ زور گھوڑے کی مانند ہو جاتا ہے۔ جو سوار کے قابو میں نہیں رہتا تعلیم کا درخت جو ہندوستان میں بویا گیا وہ بنگال میں اور جنوبی ہندوستان میں بڑا ہوا۔ بخوبی پھلا اور پھولا اور بار آور ہوا۔ مگر آخر کار بار خاطر ہوا۔ نہ یار شاطر۔ اپر انڈیا کے باشندوں نے عام طور پر اور تمام ہندوستان میں مسلمان قوم نے اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کیا۔ مسلمانوں نے اب اس سے فائدہ اٹھانا شروع کیا ہے معلوم نہیں کہ پھل لانے یعنی اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے کے بعد وہ بھی بار خاطر ہوں گے یا یار شاطر۔ مگر ہماری رائے یہ ہے کہ اگر اشراف خاندان کے مسلمانوں کے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ہوئی اور درستی اخلاق کا بھی سبق پڑھا گیا اور ان کی عمدہ سوسائٹی بن گئی جو درستی اخلاق کے لئے نہایت ضروری ہے۔ تو اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے پر وہ بار خاطر نہ ہوں گے بلکہ یار شاطر ہوں گے۔ بہر حال اس وقت جو تعلیم ہندو بنگالیوں کو بمبئی کے پارسیوں کو بمبئی و پونا کے برہمنوں اور مرہٹوں کو دی گئی اور جس کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم کہا جاتا ہے اس سے ہندوستان کے حق میں کوئی اچھا پھل ہاتھ نہیں لگا۔ پہلے تو انہوں نے اپنے تئیں اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ اور اعلیٰ درجہ کا اسٹیٹسمین یعنی مدبر امور سلطنت سمجھ لیا۔ پھر اس بات کے درپے ہوئے کہ انگلش گورنمنٹ جس طرح کہ یورپ میں حکومت کرتی ہے اسی طرح ہندوستان میں حکومت کرے اور گورے کالے اور فاتح مفتوح میں کچھ فرق نہ سمجھے۔ پھر

انہوں نے اس تعلیم سے ایک لفظ آزادی کا سیکھا اور اس کے معنی یہ سمجھے کہ جو کچھ منہ میں آوے یا خیال میں گزرے بلالحاظ اس بات کے کہ وہ صحیح ہے یا غلط- موقع ہے یا بے موقع اس کی تائید کے لئے کافی دلیلیں ہیں یا نہیں- اس سب کو کہنا اور چھاپنا اور تمام ہندوستان میں شائع کرنا ہے-

پھر انہوں نے ایک لفظ ایجی ٹیشن کا سیکھا اور کہا کہ دیکھو آئرلینڈ والے کیسا ایجی ٹیشن گورنمنٹ کی تجویزوں پر کرتے ہیں- انجمنیں اور سوسائیٹیاں ایجی ٹیشن کے لئے بناتے ہیں اور اسپیچوں اور تحریروں میں جو کچھ چاہتے ہیں کہتے ہیں-

پھر ان کے خیال میں گذرا کہ انگریزی گورنمنٹ اسی قسم کی گورنمنٹ ہے کہ وہ عام ایجی ٹیشن سے ڈرتی ہے اور جب تک ایجی ٹیشن نہ کیا جاوے اس وقت تک کوئی مطلب انگلش گورنمنٹ سے حاصل نہیں ہو سکتا-

پھر وہ سمجھے کہ ایجی ٹیشن جب تک عام نہ ہو اور عام رعایا یا ملک کے باشندے ایجی ٹیشن پر متفق نہ ہوں- اس وقت تک نہ ایجی ٹیشن ہو سکتا ہے اور نہ مفید ہوتا ہے انہوں نے ایجی ٹیشن کے عام کرنے پر کوشش شروع کی-

جب تک گورنمنٹ کی برائیاں صحیح یا غلط واجب یا ناواجب عام لوگوں میں نہ پھیلائی جاویں- اس وقت تک بمقابلہ گورنمنٹ کے عام ایجی ٹیشن کی بنیاد قائم ہی نہیں ہو سکتی- اس خیال پر نیشنل کانگرس کا وجود ہوا- اور اس نے گورنمنٹ کی نسبت جہاں تک ہو سکا برائیوں کو تمام ہندوستان میں پھیلایا اور جن باتوں پر اس سے پہلے لوگوں کو خیال بھی نہ تھا ان کو ایک برائی کے پیرایہ میں بیان کر کر لوگوں کو چوکنا کر دیا- اور برٹش گورنمنٹ کی صورت کو ایک خود غرض گورنمنٹ اور ہندوستان کو لوٹنے والی گورنمنٹ بنا کر لوگوں کو دکھایا- اور اپنے گروہ کو ایک تعلیم یافتہ لوگوں کا گروہ قرار دیا- جن کی پیروی ان تمام لوگوں نے اختیار کی جو کالجوں سے تعلیم پا چکے تھے اور جو تعلیم پا رہے تھے یہاں تک کہ اسکول کے لڑکوں نے جو اے بی سی ڈی کا تلفظ بھی بخوبی ادا نہیں کر سکتے تھے ان کی پیروی کرنا اور تعلیم یافتہ گروہ میں شامل ہونا اپنا فخر سمجھا-

ہم ہرگز اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ ایجی ٹیش کرنے والوں کا جو گروہ ہے اس کی نیت گورنمنٹ سے بغاوت کرنا یا لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنا ہے- مگر جو کچھ انہوں نے کیا اور

جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے عام ناراضی کا گورنمنٹ سے پھیلانا لازم اور ضروری ہے۔ اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ وہ ناراضی اکثر بلکہ عموماً ناواجب اور محض بے جا ہے اور اس سے از خود باغیانہ خیالات لوگوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

بے شک یہ ناراضی پھیلانے والے اپنے تئیں خیر خواہ اور وفادار گورنمنٹ کا کہتے ہیں اور غالباً سچ بھی ہو۔ مگر جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے عام رعایا میں ناراضی اور گورنمنٹ سے برخلافی پیدا ہوتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی باہمی بات چیت میں جو گورنمنٹ سے متعلق ہے ٹرن بدلی ہوئی ہے تمام یا قریباً تمام اخباروں کی وہ اردو زبان کے ہوں یا ہندی کے یا مرہٹی زبان کے ہوں یا گجراتی کے یا انگریزی زبان کے ہوں جو ہندوستانیوں کی جانب سے جاری ہیں تو بدلی ہوئی ہے اور اس بات سے کہ انہی وجوہات سے بہ نسبت سابق کے عام لوگوں کے دلوں میں گورنمنٹ سے ناراضی پھیل گئی ہے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

مسلمان سوائے بعض کے اب تک نیشنل کانگرس میں اور اس کے ایجی ٹیش میں شامل نہیں ہوئے ہیں اور جو شامل ہوئے ہیں انہوں نے نہیں سمجھا کہ اس سے قوم کو اور ملک کو کیا نقصان پہنچا ہے اور آئندہ پہنچے گا۔

جو لوگ کہ ایجی ٹیشن کی مخالفت کرتے ہیں ان کی نسبت ایجی ٹیشن کرنے والے کہتے ہیں کہ وہ گونمنٹ کی خوشامد کرتے ہیں۔ ان کا جو دل چاہے کہیں۔ مگر ایجی ٹیشن سے مخالفت کرنے والے اپنے دلی یقین سے یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ اگر ان ایجی ٹیشن کرنے والوں کی درخواستیں منظور کرلے (حالانکہ ایسا ہونا ناممکن ہے) تو ہندوستان کے انتظام اور اس کے امن امان میں خلل عظیم واقع ہو گا اور اسی یقین پر وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں نہ گورنمنٹ کی خوشامد سے۔

اگرچہ مسلمان نیشنل کانگرس کے ایجی ٹیشن میں شریک نہیں ہوئے لیکن اکثر ان اخباروں نے بھی سوائے بعض کے جو مسلمان ایڈیٹروں کے ہاتھ میں ہیں اور اخباروں کی دیکھا دیکھی اپنے جامہ سے قدم باہر رکھ دیا ہے۔ اور مضامین کی تحریر میں ان کے قلم میں بھی کوئی روک نہیں رہی۔ جو نہایت افسوس کے قابل ہے مگر ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اگر بالفرض ہندوستان کے تمام ہندو اور مسلمان نیشنل کانگرس کے ساتھ ایجی ٹیشن میں شریک ہو جاویں اور تمام اخبار ہندو اور مسلمانوں کے مضامین خلاف واقع اور برخلاف گورنمنٹ لکھنے

پر متفق ہو جاویں تو بھی گورنمنٹ کا کچھ نقصان نہیں ہونے کا۔ہاں مجبوری گورنمنٹ کو دائرہ آزادی کو جو اس وقت ہے زیادہ تنگ کرنا پڑے گا۔ اور مجبوری اس کو ہندوستانی اخباروں کی آزادی چھین لینے پر قانون بنانا ہو گا اور یہ گورنمنٹ کا کچھ قصور نہیں ہو گا جو کچھ گورنمنٹ کرے گی وہ ہندوستانیوں ہی کی بداعمالی کی سزا ہو گی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جو گورنمنٹ نے تمام ہندوستان سے ہتھیار چھین لئے اور بغیر لائسنس کے کسی کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ اس میں گورنمنت کا کچھ قصور ہی نہیں بلکہ یہ ہندوستانیوں کے اعمال کی سزا ہے جو انہوں نے غدر ۱۸۵۷ء میں کئے تھے۔ ہر ایک انصاف کرنے والا سمجھتا ہو گا کہ ہندوستانیوں نے اپنی بداعمالی ایسے درجہ کو پہنچادی تھی کہ گورنمنٹ کو مجبور قانون اسلحہ جاری کرنا پڑا تھا۔

جن لوگوں نے اس زمانہ میں ترکی کی فتح یابی پر ہندوستان میں متعدد جلسے کئے اور سلطان کو مبارک بادی کے تار اور ایڈریس بھیجے وہ خود سمجھتے ہوں گے کہ اس خفیف الحرکتی سے کیا نتیجہ نکلا۔ یورپ کی سلطنتوں کی پالیسی ترکی کی نسبت جو ہوئی ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کے مسلمان سلطان ترکی کی کیا مدد کر سکتے ہیں اور اس خوشی منانے سے سلطان کو کیا فائدہ ہوا۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو جنہوں نے یہ خوشی منائی کیا نتیجہ حاصل ہوا۔ بجز اس کے کہ چند احمقا اور جاہلوں نے یہ سمجھا کہ سلطان ترکی کی فتح یابی پر خوشی منانے والے نہایت پکے مسلمان ہیں جو سلطان کی فتح یابی پر خوشی مناتے ہیں۔ اور خوشی منانے والوں نے اپنی بزرگی اور تقدس کو احمقوں اور جاہلوں کے نزدیک ثابت کرنا چاہا۔

ہم جب ان کو بڑا دیندار سمجھتے کہ وہ روس کی رعیت ہوتے اور سلطان ترکی کی فتح یابی پر اس طرح پر جشن مناتے اور خوشیاں مناتے معلوم نہیں کہ کتنے آدمی پھانسی پاتے اور کتنے گولی سے مارے جاتے اور کتنے سائبیریا بھیجے جاتے غالباً گورنمنٹ نے بھی اس کو ناپسند کیا ہو گا مگر یہ انگلش گورنمنٹ ہی کا رحم ہے۔ جس نے ان باتوں پر کچھ مواخذہ نہیں کیا۔

تمام ہندوستان کے باشندوں کی اور بالتخصیص مسلمانوں کی خیروعافیت اسی میں ہے کہ سیدھی طرح انگلش گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی بسر کریں اور خوب سمجھ لیں کہ مذہب اسلام کی یہی ہدایت ہے کہ جن کی ہم رعیت ہو کر اور مستامن ہو کر رہتے ہیں ان کے ساتھ وفادار رہیں اور ان کی بدخواہی نہ اپنے دل میں لاویں نہ بدخواہوں کے ساتھ شریک

ہوں ان کو اپنا دنیوی شہنشاہ اور خداوند تعالیٰ جلشانہٗ کو شہنشاہوں کا شہنشاہ اور اپنا مالک حقیقی سمجھتے رہیں۔ سعدی علیہ الرحمتہ نے بوستان میں لکھا ہے۔

سزدگر بدورش بنازم چناں

کہ سید بدوران نوشیرواں

جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا شکر فرماتے تھے کہ وہ سلطان عادل یعنی نوشیرواں کے عہد میں پیدا ہوئے۔ نوشیرواں آتش پرست بادشاہ تھا لیکن عادل تھا اس کے زمانہ میں پیدا ہونے پر اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا شکر کیا ہے تو ہم کو ایسے بادشاہ کی رعیت ہونے سے جس نے ہمارے مذہبی امور بجالانے میں ہم کو کمال آزادی دے رکھی ہے کیوں نہ خدا کا شکر بجالاویں اور اسی کی درازی عمر و دولت واقبال کی کیوں نہ خدا سے دعا کریں۔

قوم کی زندگی اور موت (ناتمام)

ہر ایک قوم کی ترقی' عروج اور نام آوری کی ایک عمر ہوتی ہے جس طرح کہ ایک انسان کی۔ انسان پیدا ہوتا ہے بڑھتا ہے جوان ہوتا ہے' بڈھا ہوتا ہے اور اخیر کو مرجاتا ہے۔ اس کے بڑھنے جوان ہونے بڈھا ہونے مرنے کے طبعی اسباب ہوتے ہیں جو کسی کے روکے سے رک نہیں سکتے اسی طرح ایک وحشی قوم ترقی کرتی ہے نام آور ہوتی ہے' عروج پر پہنچ جاتی ہے' پھر تنزل شروع کرتی ہے' بڑھاپا اس پر آجاتا ہے اور پھر ایسی گم نام ہو جاتی ہے کہ اس پر موت کا اطلاق ہوتا ہے۔

قوم کا تنزل ایک طبعی امر ہے جس طرح انسان کا بڈھا ہونا طبیعی امر ہے۔ بڑھاپے کے امراض کو لوگ جانتے اور پہچانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مرض ہے مگر نہ اس کی دوا ہو سکتی ہے اور نہ وہ جاسکتے ہیں کیونکہ وہ طبیعی ہوتے ہیں اور طبیعت بدلتی نہیں۔ جو لوگ قوم کے خیر خواہ ہوتے ہیں وہ ان مرضوں کی تشخیص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا علاج ممکن ہے اور نہایت کوشش سے اس کے علاج پر متوجہ ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ہمارے ہی قصور اور غفلت سے یہ مرض لگ گئے ہیں مگر در حقیقت یہ بات یوں نہیں ہوتی۔ بلکہ قوم کی طبیعت ہی ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ امراض جو باعث تنزل ہیں خود قوم کی طبیعت بن جاتے ہیں اور اس لئے علاج پذیر نہیں ہوتے۔

عرب کی وحشیانہ حالت سے ترقی کی پہلی سیڑھی تمدنی حالت کی طرف مائل ہونا تھی۔ ان لوگوں نے جو خانہ بدوش پھرتے تھے مختلف مقامات پر سکونت اختیار کی اور توالد و تناسل سے آبادی کی کثرت ہوتی گئی۔ ان کے تمدنی تعلقات صرف اسی گروہ میں محدود تھے جو ایک جگہ آباد تھی ہر ایک گروہ دوسرے گروہ سے اس طرح علیحدہ رہتے تھے جیسے مختلف قسم کے جانور کہ باوجود ایک میدان میں رہنے کے ایک دوسرے سے علیحدہ رہتے ہیں اس تفرق کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایک گروہ کے لئے جدا جدا نام اور لقب قائم ہوں تاکہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے ملنے نہ پاوے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کے معبود کو پسند نہ کرے بلکہ اپنے اپنے لئے جدا جدا معبود قرار دے۔ ایک دوسرے پر غلبہ اور تفوق کی کوشش کرے اور گروہوں میں ہمیشہ جنگ و جدل و بغض و عداوت قائم رہے۔ عرب کی یہی حالت تھی جب کہ اس نے

ترقی شروع کی تھی اور گو یہ سب باتیں ترقی کے موانع میں سے تھیں لیکن زوال پذیر تھیں کیونکہ قوت نمو موجود تھی اور وہ ان سب موانع کو دور کر سکتی تھی جیسے کہ ایک بچے کی قوت نمو اس کے ضعف کو اور ان امراض کو جو طبعی طور پر بچپن میں لاحق ہوتے ہیں دور کرتی ہے مگر جب یہی امراض کسی قوم میں ترقی کے بعد لاحق ہوتے ہیں تو وہ زوال پذیر نہیں ہوتے جیسے کہ بچپن کے زمانہ کے امراض بڑھاپے میں لاحق ہونے سے جا نہیں سکتے۔

ان کی قوت نمو کچھ نہ کچھ ان امراض کو دور کرتی جاتی تھی اور وہ ایک دوسرے کے حلیف ہونے لگے تھے مگر ان میں ایک ایسی قوی قوت نمو کی ضرورت تھی جو ان سب مرضوں کو دفعتاً دور کر دے۔ وہ زمانہ آیا اور حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ فَاتَّبِعُوْنِیْ کل قومیں اس کلمہ کی مخالفت میں متحد ہو گئیں اور یہی اتحاد گو کہ مخالفت میں تھا اس قوی قوت نمو کے پیدا ہونے یا موجود ہونے کی بشارت دیتا تھا۔ تمام مختلف امراض جو قوموں میں تھے اس کے مقابل مضمحل ہو گئے یا معدوم یا قریب معدوم ہونے کے پہنچ گئے صرف ایک مرض شدید "لا نسلم انت رسول اللہ" کل قوموں میں پھیلا ہوا رہے گا۔ تائید الٰہی اور نصرت سماوی نے یا یوں کہو کہ سچ کے طبیعی اثر نے یا نمو کی طبیعی قوت نے اس امراض کو دور کیا اور سب نے کہا "شھد انت رسول اللہ بنتعک" دفعتاً تمام موافق ترقی دور ہو گئے، قوت نمو اپنی پوری قوت سے اپنا کام کرنے لگی۔ سب کا معبود ایک ہو گیا۔ تمام اختلافات دور ہو گئے، عداوتیں مٹ گئیں، آپس کی لڑائیاں موقوف ہو گئیں، دینی اور دنیاوی سرداری نے ایک مرکز پر قرار پایا اور تفوق کی مخالفانہ خواہشیں جو ایک کو دوسرے کے تھیں، جاتی رہیں۔ اور برخلاف اس کے اطاعت اور محبت اور اتفاق اور ہمدردی میں تفوق حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ تمام مختلف گروہیں ایک قوم ہو گئیں۔ قومیت کا اصول جو نسل پر محدود تھا وسیع ہو گیا اور جس نے کہا۔ "اشھد ان لا الہ الا اللہ و ان محمد رسول اللہ" کسی نسل کا تھا اسی ایک قوم کا ہو گیا۔ "کما قال اللہ تعالیٰ انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقو اللہ لعلکم ترحمون۔ قوم قوم ہو گئی جوانی میں بھرپور ہو گئی، ترقی اور عروج کے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی۔ خدا نے بھی اس پر اپنا بڑا احسان جتایا اور فرمایا۔ "ھوالذی اید ک بنصرہ وبالمومنین الف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم انہ عزیز حکیم"۔ افسوس کہ یہ جوانی کی عمر صرف دس برس رہی۔



تعارف

نام: ڈاکٹر شاہد مختار

تعلیم: ایم اے انگلش۔ ایم اے ہسٹری

ایم سی ایس۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی (امریکن ہسٹری)

ہماری دیگر مطبوعات



شاہد پبلشرز

چوبرجی سنٹر ملتان روڈ لاہور فون ۷۳۱۹۹۶۳

E-mail: shahidpublications@hotmail.com Web : www.shahidpublications.0catch..com